حسن عباس رضا

محبت کے ساتھ
حسن عباس رضا

عشق بدوش

حسن عباس رضا

دوست پبلی کیشنز

اسلام آباد - لاہور - کراچی

ضابطہ

ISBN: 978-969-496-486-7

کتاب : عشق بدوش

شاعر : حسن عباس رضا

موسم اشاعت : 2015

سرورق : حنیف رامے (مرحوم)

بشکریہ پی این سی اے / ابراہیم رامے

مطبع : ورڈ میٹ، اسلام آباد

قیمت : 300.00 روپے

دوست پبلی کیشنز

پلاٹ 110، سٹریٹ 15، I-9/2، اسلام آباد

فون: 051-4102784-85

E-mail: dostpub@nayatel.pk

اَنعم اور ہادیہ

کے نام

ہم ایسے عشق بدوش اب ملیں گے دو ہی جگہ
درِ وصال پہ، یا دُکھ کی خانقاہوں پر

ترتیب

نظمیں 135

پیش لفظ

حسن عباس رضا کی شاعری بھی اب اکابرین و رفتگاں کی طرح دو چار برس کی بات نہیں رہی، بلکہ لگ بھگ چالیس برس کا قصہ ہے۔ میں حسن عباس رضا کو ستر کی دہائی سے، اُس وقت سے جانتا ہوں جب وہ ابھی اپنے شعری پر پُرزے نکال رہے تھے لیکن اُس وقت بھی حسن کی اُڑان میں ایک انداز دلربائی تھا، جو اس عمر میں بھی شہزادوں کا منصب ہوتا ہے۔

میں جو ہمیشہ سے شعری آسمان کے ستارے گنتا رہا ہوں، ادبی اُفق پر حسن کی سخنورانہ چمک دمک سے اُن کے تیور پہچان گیا تھا۔ میں نہ تو خود کو نقاد سمجھتا ہوں اور نہ ہی کوئی ایسا شاعر ہوں جس کا نام شاعری کے تینوں یا تیروں میں مرقوم ہو۔ میں اُردو کی شعری کائنات میں اجنبی ہوں مگر آواز، اسلوب، لب و لہجے اور انداز سے شاعر کی قدر و منزلت کا اندازہ حتی المقدور لگا لیتا ہوں۔ چنانچہ اسّی کی دہائی میں جب میں نے حسن عباس رضا کی ذیل کی غزل سُنی تو مجھے لگا کہ میں نے ایک اور سچا اور کھرا شاعر ڈھونڈ لیا ہے۔ میں بار بار یہ غزل گنگناتا اور اس کے آہنگ سے لطف اندوز ہوتا رہا۔

اُس شب کتنا ٹوٹ کے روئے، چاند، ہوا اور میں
تینوں ہی اک ساتھ اُجڑے تھے، چاند، ہوا اور میں
چاند، ہوا اور مجھ میں جاناں! کوئی فرق نہیں
ایک سی رُت کے چاہنے والے چاند، ہوا اور میں
حسن رضا، وہ رات مُرادوں والی جب بھی آئی
دیکھنا کیسے گلے ملیں گے، چاند، ہوا اور میں

شاعری، میرے نزدیک چاند اور ہوا سے گلے ملنے کا ہنر ہے اور حسن رضا اس ہنر میں ولی کے مرتبے

کو پہنچے ہیں۔ اُن کی شاعری اپنے عہد کی ساری منفرد، ممتاز، معتبر اور موقر شعری آوازوں کا تخلیقی ماحصل ہے۔ وہ زمانہ جس میں فیضؔ، فرازؔ، منیرؔ، ندیمؔ، ناصرؔ، جالبؔ، احمد مشتاقؔ اور جون ایلیاؔ سے لے کر اقبال ساجدؔ اور سبط علی صباؔ تک کی آوازیں غزل کی سمفنی مُرتب کر رہی تھیں اور سخن سازی کی رصدگاہ ایک نئے ستارے کے طلوع کی نوید دے رہی تھی۔ اس ستارے کا نام تھا حسن عباس رضا، جو پچھلی چار دہائیوں سے، غزل کی سرزمین میں، ایک کوہِ گراں کی طرح رُکا ہوا ہے اور ساتھ ہی ہر غزل میں جان سے بھی گزرتا ہے۔ وہ اپنی ذات کی کشف گاہ میں کسی صوفی کی طرح عرفان کی گتھیاں سلجھاتا رہتا ہے، جو جان جوکھوں کا کام ہے۔

مجھے یہ خبر ہے کہ جس دن بھی اپنے مقابل میں آیا
مری ذات میں مورچہ بند خودسر، مجھے مار دیں گے

یہ ایک متبرک شعر ہے، جس کی کڑیاں ایک طرف عرفانِ نفس کے صوفی دھارے سے ملتی ہیں اور دوسری طرف معاشرتی بے نظمی اور انتشار کے ضمن میں کلمۂ حق ہے اور پھر اس پر ہی بس نہیں، شاعر تیاگ اور ترک کے اسماء کا ورد بھی کرتا ہے اور روح کے پرندے کی طرح پر کھول کر بالغیب کی فضاؤں کی سیر بھی کرنا چاہتا ہے۔

حسنؔ، اب کھلے آسمانوں میں مسکن بنانا پڑے گا
وگرنہ، یہ خشتِ ہوس سے بنے گھر مجھے مار دیں گے

یہ وہی درویشی روایت ہے جو میرا بائی اور حضرت کبیر داس بھگت سے ہوتی ہوئی غالبؔ، بیدلؔ اور میرؔ کے توسل سے اُردو غزل میں در آئی ہے۔ حسنؔ نے صرف اس روایت سے ہی استنباط نہیں کیا، بلکہ اپنی مٹی کے مقامی وجود کو اپنی شعری سرزمین میں بڑے اہتمام اور عقیدت سے آباد کیا ہے۔ ذرا یہ لہجہ ملاحظہ ہو۔

دے ہاتھ میں سوہنا ہاتھ کہ بجری بج بجے
پھر چھیڑ ملن کی بات کہ بجری بج بجے
جس طور تُو نے کی ہے معطر شبِ وصال
ممکن ہے ویسا رات کی رانی نہ کر سکے
کل تیرے تشنگاں سے یہ کیا معجزہ ہوا
دریا پہ ہونٹ رکھے، تو دریا تمام شد

ہمیں تو دُکھ ہی پڑھایا گیا ہے مکتب میں
کہ دوسرا وہاں کوئی نصاب تھا ہی نہیں

ابھی تو ماں جائی نے اپنے ویر کو سہرا باندھنا تھا، پر
اپنی ماں کو چھوڑ کے جانے والا بیٹا گھر نہیں آیا

ان شعروں میں اپنی مٹی کی خوشبو اور کلاسیکی روایت سے حسن عباس رضا نے خیال کا جو پیکر تراشا ہے، اُس سے اردو غزل کے نک سک میں ایک نویکلا پن عود کر آیا ہے۔

ہم پنجابیوں کی تخلیقی روایت بھی عجیب ہے کہ ہم اردو زبان بھی پنجابی طمطراق اور رکھ رکھاؤ سے لکھتے ہیں جو ہماری پاکستان کی نئی اردو کو ماقبل تقسیم کی روایتی اردو سے الگ شناخت دیتی ہے۔ یہ نئی اُردو ڈھول کے ڈگے پر بِد حاڈالتی ہوئی خالص پاکستانی اُردو ہے اور یہی اس کا نوکیلا پن ہے۔

بیٹیاں جیسی بھی تھیں، ماں کو لگیں شہزادیاں
یہ بجا، لیکن وہ قسمت کی نہ تھیں شہزادیاں
جسم کی چاندی سفر کرتی سروں تک آ گئی
اب ملن رُت کا کریں کیسے یقیں شہزادیاں

ممکن ہے رومانوی شاعری کے دلدادگان کے لیے یہ ایک معمولی بیان ہو مگر ہماری مروجہ سماجیات کے تناظر میں یہ ایک خودکش جیکٹ کا استعارہ ہے جہاں لڑکیاں شادی کے نام پر زندہ جلادی جاتی ہیں۔ ہمارے یہ معاشرتی المیے موہنجوداڑو کی روایت کا تسلسل ہیں اور وہ عرب کلچر جس میں حق مہر کے نام پر بیٹیوں کی بار قیمت وصول کی جاتی ہے، ہماری معاشرت کے لیے اجنبی واردات ہے جب کہ حسن عباس رضا کا یہ شعر مقامی روایت کا آئینہ دار ہے۔ غزل ہماری تخلیقی روایت کا قدیم شعری اثاثہ ہے جو فارسی سے اُردو میں وارد ہوا۔ فارسی میں فنِ غزل گوئی کے ایسے بڑے بڑے فن کار ہیں کہ جن کے ایک ایک شعر پر ناطقہ سر بہ گریباں رہ جاتا ہے۔ کتنے بڑے بڑے نام ہیں، عرفی، نظیری، حافظ، صائب، عراقی، بیدل اور امیر خسرو جن کی فارسی غزل کی بوقلمونی اور نکتہ آفرینی نے برِ کوچک کے اردو شعرا کو وہ جہت اور سمت عطا کی، جس نے اردو غزل کو اصنافِ سخن کی شہزادی بنا دیا ہے اور شہزادیوں سے شہزادے عشق کیا ہی کرتے ہیں، چنانچہ حسن عباس رضا نے بھی یہی کیا ہے۔ حسن عباس رضا کی غزل اُس کا عشق ہے، حسن عباس رضا کے

چاروں شعری مجموعوں کی گواہی سے یہ طے ہو جاتا ہے کہ حسن اپنے عشق کے امتحان میں پورے اترے ہیں۔ وہ چار دہائیوں سے غزل کے تاکستان میں اپنی سریلی بانسری بجارہے ہیں۔ غزل سرائی جاری ہے اور حسن رضا کے شعروں میں تھکن کے آثار نہیں ہیں۔ وہ اب بھی ویسے ہی تازہ دم ہیں جیسے چار دہائیاں پہلے تھے اور غزل سے اپنے عشق کے نو بہ نو قرینے مسلسل ایجاد کرتے رہتے ہیں۔ لیجیے سنیے۔

فون پہ اُس کی باتیں، اُس کے قہقہے اچھے لگتے ہیں
پل دو پل کے سہی مگر یہ رشتے اچھے لگتے ہیں

شام کی آخری پرواز سے آسکتی ہو
تم بھرے شہر سے ہو کر بھی تو جاسکتی ہو

میں نے جس جس کو بھی چاہا ہے،، بہت چاہا ہے
تم کسی ایک سے تصدیق کرا سکتی ہو

اب جو آبیٹھا ہے آسیب محبت مجھ میں
کسی مرشد کسی عامل سے نہیں نکلے گا

مگر ایسے اشعار پڑھ کر حسن کو میگھ ملہار کا راگی نہیں سمجھ لینا چاہیے کیونکہ وہ دیپک بھی گاتے ہیں، وہ باغی اور سخت گیر سیاسی محتسب بھی ہیں، جب جب موقع ملا انہوں نے جبر و اکراہ اور طاغوت کے عفریتوں کی کھل کر مذمت کی ہے۔

ہمیں خبر تھی شہر پنہ پر کھڑی سپاہ منافق ہے
ہمیں یقیں تھا، نقب زنوں سے یہ دستہ مل جائے گا
حرم سراؤں میں پلنے والی کنیز بھی اب یہ جانتی ہے
کہ انہدامِ فصیلِ قصرِ شہی میں بس چند تانیے ہیں
بٹھا دیئے گئے پہرے جنازہ گاہوں پر
سو ہم نے دفن کئے خواب شاہراہوں پر

یہ پانچ وقتی منافق ہیں بارسوخ اتنے
کہ جل رہی ہیں انہیں خلعتیں گناہوں پر

حسن عباس کا یہ مزاحمتی رویہ، اُسے، اُس روایت سے منسلک کرتا ہے جو اس کے شعری آہنگ کو فیض، فراز اور جالب کے باغیانہ رویوں سے جوڑتی ہے۔ حسن نے کمال مہارت وصناعی سے سارے ہم عصر باغیانہ رویوں کا کولاژ مرتب کیا ہے اور اب اپنے عہد کی باوقار اور بااعتبار آواز بن کر عصری افق پر ستارے کی طرح چمک رہے ہیں۔ حسن کی غزل گوئی وہ بر کھا ہے جو لگاتار برستی ہے اور رم جھم کا یہ سرگم تھمنے میں ہی نہیں آتا۔ اس کی غزل کا تخلیقی کینوس وقت کے ساتھ ساتھ پھیلتا ہی چلا گیا ہے اور اب یہ ایک پوری شعری کائنات ہے، جس میں وہ دنیا بھر کے مظلوموں کا شریکِ غم ہے۔

حسن عباس رضا کی غزل گوئی کی تاریخ اپنی جگہ مگر میں اہلِ فکر ونظر کو اپنے وجدان کے اُس اشارے سے روشناس کرانا چاہتا ہوں جو مجھے ہمیشہ یہی یاد دلاتا رہا ہے کہ حسن عباس رضا بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں۔ لگتا ہے انہوں نے سہل پسند قارئین کے لیے نظم کے بجائے غزل کا راستہ اپنایا ہے تاکہ ابلاغ کے تعطل کا مسئلہ پیدا نہ ہو۔ ویسے بھی شرعی حکم یہی ہے کہ لوگوں سے ان کی عقلوں کے مطابق بات کرو۔ لیکن مجھے حسن عباس رضا کی نظموں نے اتنا متاثر کیا ہے کہ میں حضرت جوش ملیح آبادی کی طرح صنفِ غزل کے انکار کو جائز سمجھنے لگا ہوں۔

مجھے نہیں پتہ کہ حسن عباس رضا کے مداحوں نے اُن کی نظموں سے استفادہ کیا ہے یا نہیں، مگر مجھے اُن کی جن نظموں نے ان کی نظم نگاری کا گرویدہ کیا، اُن میں شامِ غریباں، نذرِ فیض اور ''ایک خوش خط چہرے کے نام'' مجھے بہت لبھاتی رہی ہیں۔ کیا ہم وہ نظم ایک ساتھ نہ پڑھیں؟

تم اتنی خوب صورت ہو
کہ حُسنِ دہر کے سب استعارے
ساری تشبیہیں
تمہارے جھلملاتے روپ کے دربار میں
نظریں جھکائے
دست بستہ ایستادہ ہیں

تم اتنی خوب صورت ہو۔

تمہارا پیکرِ طناز

یونانی خداؤں کی چہیتی دیویوں سا ہے

تمہارے ہونٹ

جیسے مرمریں سل پر

کسی نے آتشِ گل کی لرزتی، پھرپھڑاتی

آگ برساتی ہوئی دو پتیاں رکھ دیں

تمہارے چاند چہرے کے بیچ تل پر

سمرقند و بخارا کیا

ہم اپنی ساری دنیا بھی اگر واریں

تو کم ہوگی

تم اتنی خوب صورت ہو

نظم ختم نہیں ہوئی۔ ''غزل الغزلات'' کی تلاوت جاری ہے۔ میں اس حسن بیان کے نشے میں مدہوش ہوں۔ یہ نظم، نظم کہنے کے سلیقے کی گواہی ہے۔ اور اگر میں حسن عباس رضا کی ساری نظموں کا مجموعی تاثر بیان کروں تو مجھے اسی روایت کا حاصل لگتا ہے جسے اقبال، جوش، میرا جی، مجید امجد، ن م راشد اور تصدق حسین خالد نے پروان چڑھایا تھا۔ حسن نے اپنے پانچوں شعری مجموعوں میں ایک ایسا شعری جہاں تخلیق کیا ہے جو نہ صرف بطور شاعر اس کے اعتبار کو سند ہے بلکہ انفرادیت کی دلیل بھی۔ حسن عباس رضا کی ''عشق بدوش'' کے قارئین کو یاد دلاتا چلوں کہ حسن ایک ایسے صاحب کشف شاعر ہیں جو لفظوں کو چھو کر زندہ کردینے کا اسم جانتے ہیں۔ میں بطور شاعر حسن عباس رضا کی شاعری سے محبت کرتا ہوں۔ حسن عباس رضا! شاعری مبارک ہو۔

مسعود منور

Christian,Braunmansvei7,
3043 Drammen
Norway

کچھ اپنے بارے میں

یہی سنتا اور پڑھتا آیا ہوں کہ اپنے بارے میں کچھ کہنا یا لکھنا بہت مشکل کام ہے، سچ پوچھیں تو میں اسے محض کسر نفسی کی ایک قسم سمجھتا رہا، مگر...... جب آج اپنے بارے میں کچھ لکھنے بیٹھا تو قلم تک کو پسینہ آ گیا۔ سچ بات تو یہ ہے کہ حرف گری کرتے ایک زمانہ بیت گیا اور میں اس زعم میں تھا کہ لفظ میرے دیرینہ رفیق ہیں، جب بھی انہیں بلاؤں گا، یہ دوڑے چلے آئیں گے، مگر...... اے مگر...... میری بے بسی کا سب سے بڑا سہارا بن گیا ہے، سو کیا کیا جائے، کہیں سے تو آغاز کرنا پڑے گا۔ ایک اور بات کہتا چلوں کہ اپنے بارے میں کچھ لکھنے کا حکم چند دوستوں کا تھا لہٰذا انکار نہ ہو سکا۔

سو، کیوں نہ اپنی اس تحریر کا آغاز، اپنے آغاز سے مربوط کر دوں؟ شاید بات بن جائے۔

راولپنڈی میں 20 نومبر 1951ء کو پیدا ہوا، میرے والد صاحب صوفی محمد زمان اسلامیہ ہائی سکول، راولپنڈی میں اردو اور فارسی کے معروف استاد تھے، متعدد سینئر ادیب اور شاعر ان کے شاگردوں میں شامل ہیں۔ میں نے بھی اردو، فارسی کی تعلیم انہی سے حاصل کی۔ وہ صحیح معنوں میں صوفی منش اور انتہائی نیک، انسان دوست شخصیت تھے۔

ہم پانچ بھائی اور ایک بہن...... گھر میں چونکہ کتابیں موجود تھیں اور خاص طور پر میرے دو بڑے بھائیوں کو انگریزی اور اردو ادب سے دلچسپی تھی...... ابتدا میں موجود کتب سے استفادہ کیا، مجھ سے بڑے بھائی ارشد محمود (مرحوم) کے پاس اردو ادب کی بہت زیادہ کتابیں تھیں، پہلی بار فیض احمد فیض، احمد فراز،

مصطفیٰ زیدی اور ساحر لدھیانوی کی کتب کا مطالعہ کیا، چونکہ ایک پیدائشی شاعر اندر موجود تھا، سو 1973ء میں پہلا شعر اور ایک غزل لکھی، میں ان دنوں میں محکمہ تعلیم میں کام کر رہا تھا۔ اتفاق سے ہمارے ڈائریکٹر ممتاز مرثیہ گو شاعر ڈاکٹر سید صفدر حسین تھے، ان کو جب میں نے غزل اور شعر دکھایا تو ان کو خوش کن حیرانی ہوئی کہ اتنی چھوٹی عمر میں بھی اشعار موزوں اور تکنیکی اعتبار سے درست تھے، البتہ ایک جگہ قافیے کی گڑبڑ تھی، ڈاکٹر صاحب نے بکمال شفقت میری رہنمائی کی۔ اسی آفس میں ہمارے ایک سینئر دوست تھے فضل الرحمٰن عظیمی، انہوں نے عروض کے بارے میں کچھ بتایا، کسی نے مشورہ دیا کہ حلقہ ارباب ذوق میں جایا کرو اور سچ پوچھیں تو میں نے حلقہ ارباب ذوق اور پنجابی ادبی سنگت میں بہت کچھ سیکھا۔ بعدازاں میں حلقہ اور سنگت کا سیکرٹری بھی رہا، اسی دوران مشاعروں میں بھی شرکت کرنے لگا اور اس کا سہرا محترم اختر امام رضوی (مرحوم) کے سر جاتا ہے۔ انہوں نے پہلی بار مجھے کل پاکستان مشاعرہ، منعقدہ تلہ گنگ میں شرکت کا موقع فراہم کیا۔

احمد فراز میرے پسندیدہ شعراء میں شامل تھے، ایک مشاعرہ ان کی صدارت میں پڑھا تو انہوں نے میرے کلام کو پسند کیا اور بہت حوصلہ افزائی کی۔ پروفیسر ماجد صدیقی ہمارے مشترکہ دوست تھے، وہ ایک دن مجھے اکادمی ادبیات پاکستان میں لے گئے، یہ اکادمی کے قیام کے ابتدائی دن تھے اور فراز صاحب اس کے پہلے سربراہ تھے۔ انہوں نے پہلی باضابطہ ملاقات میں مجھے اکادمی میں کام کرنے کی پیشکش کی۔ بھلا اس سے زیادہ میری خوش قسمتی کیا ہو سکتی تھی، میں نے فوراً حامی بھر لی اور یوں اس دن کے بعد فراز صاحب سے لازوال دوستی کا آغاز ہوا۔ اکادمی میں مجھے اپنے عہد کے عظیم شعراء اور ادباء سے ملنا نصیب ہُوا، جن میں جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، حفیظ جالندھری، سیف الدین سیف، غرض ان گنت سینئر شعراء کی صحبت میں رہ کر بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔

احمد فراز سے دوستی کا رشتہ گہرا ہوتا گیا۔ وہ مجھے اپنا بیٹا، بھائی اور دوست کہتے اور سمجھتے تھے، وہ خود کہتے تھے کہ مجھے دنیا میں صرف دو دوستوں پر اعتماد ہے، ایک ضیاء الدین ضیاء اور دوسرا حسن رضا (وہ مجھے پیار سے حسن کوزہ گر کہتے تھے)۔ فراز صاحب کے ساتھ زندگی کے بے شمار یادگار لمحے گزرے (تفصیل اس کتاب میں ہے، جو میں فراز صاحب کی زندگی اور فن پر لکھ رہا ہوں)۔

میں اس اعتبار سے خود کو دنیا کا ایک خوش قسمت ترین شخص سمجھتا ہوں، کہ ماں باپ، بہن بھائیوں،

دوستوں، اہلیہ، اہلِ خانہ اور دلداروں کی لازوال محبتوں سے میرا دامن مالا مال ہے۔

میری ایک خوش قسمتی یہ بھی ہے کہ عظیم گلوکارہ ملکہ ترنم میری بہت اچھی دوست تھیں، ان کی گائیکی کے حوالے سے اتنا ہی کہوں گا کہ اُن جیسی آواز صدیوں بعد طلوع ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ بطور انسان بھی بہت زندہ دل اور شفیق خاتون تھیں۔ اُن کی شخصیت پر ایک مضمون میری ویب سائٹ پر ہے۔

فیض صاحب نے اپنی زندگی کی آخری تحریر اپنی وفات سے 6 دن پہلے، میری پہلی کتاب ''خواب عذاب ہوئے'' کا فلیپ لکھ کر چھوڑی ہے۔ یہ فلیپ انہوں نے ہماری بہت اچھی دوست مرحومہ سرفراز اقبال کے گھر میں لکھا تھا۔

نظریاتی طور پر بائیں بازو سے تعلق ہے، لبرل اور سیکولر ہوں۔ ''کسی کے عقیدے کو مت چھیڑو، اپنے عقیدے کو مت چھوڑو'' کا قائل ہوں۔ اسلام کے ساتھ ساتھ تمام مذاہب اور عقائد کا احترام کرتا ہوں۔ مذہبی انتہاپسندی کو رد کرتا ہوں۔ اور عقائد کی بحث سے دور رہتا ہوں۔

1982ء میں میری تعیناتی پاکستان نیشنل کونسل آف دی آرٹس (پی این سی اے) میں ہوئی۔ میں ان دنوں ایک رجحان ساز ادبی مجلہ ''خیابان'' شائع کرتا تھا، ضیاء الحق کا مارشل لاء عروج پر تھا، اس مجلے میں اپنی اور دیگر شعراء اور ادباء کی ایسی تحاریر شامل تھیں، جو ظلِ الٰہی کی طبیعت پر گراں گزری تھیں۔ سو پی این سی اے میں ملازمت کے پہلے ہی دن میرے گھر پر فوج اور پولیس کی بھاری نفری نے چھاپہ مارا، میں تو گھر پر نہیں بلکہ لیاقت ہال میں منعقدہ محفلِ موسیقی کی ڈیوٹی پر تھا جہاں اقبال بانو نغمہ سرا تھیں، مجھے اطلاع دی گئی کہ اہلکار آپ کے والد صاحب کو ہمراہ لے گئے ہیں اور آپ کی لاتعداد کتابیں بھی ساتھ لے گئے ہیں۔ سو، میں فوری طور پر پیش ہو گیا اور والد محترم کو گھر بھیج دیا۔ پولیس نے نقضِ امن کی کسی شق کے مطابق اور مارشل لاء کے ضابطے کے تحت گرفتار کر لیا۔ دوسرے دن مجھے عدالت کے روبرو پیش کیا گیا، پنڈی، اسلام آباد کے متعدد وکلاء میرے ساتھ پیش ہوئے تاہم مجسٹریٹ نے مجھے ریمانڈ پر دوبارہ حکام کے حوالے کر دیا۔ پولیس نے ہتھکڑی لگا دی، اس دوران میں نے بلند آواز میں کسی استاد کا شعر دہرایا۔

تھا مجھے طفلی میں ہی ذوقِ اسیری اس قدر
کھیلتا رہتا تھا دروازے کی زنجیروں کے ساتھ

پولیس ہتھکڑی لگا کر بک شاپس سے کتابیں برآمد کرنے کے لیے مجھے صدر بازار لے گئی، پولیس

نے تمام بک سٹالز پر میری موجودگی میں میری کتابیں برآمد کیں۔ اس موقع پر مجھے فیض صاحب کی نظم بہت یاد آئی۔

آج بازار میں پابجولاں چلو

خیر جب مجھے حوالات میں لایا گیا تو بکمال مہربانی ایک چارپائی بھی دی گئی۔ حوالات والے مجھے کتاب والا بابو کہتے تھے۔ حالانکہ باقی قیدی فرش پر سوتے تھے، مجھے رات کو ایک آدھ بار پانی پینے کی عادت ہے اور میں پانی کا گلاس بھر کر اپنی کھڑکی کے پاس رکھ دیتا تھا۔ حوالات میں مجھے ہمہ وقت ہتھکڑی میں رکھا جاتا تھا، ایک دن میں نے آفیسر سے کہا کہ پلیز رات کو میری ہتھکڑی کھول دیا کریں، میں کہیں بھاگ کر نہیں جاؤں گا اور پھر ویسے بھی سوتے میں ہتھکڑی سے سر اور چہرے پر چوٹ لگتی ہے۔ اس پر انہوں نے بہت مہربانی کی اور میرے ہاتھوں سے زنجیر اتار دی...... اور پھر اسے پاؤں میں ڈال دیا۔ ایک رات مجھے پیاس لگی، کھڑکی میں رکھے ہوئے گلاس میں پانی ختم ہو چکا تھا، اور پانی کا گھڑا میری چارپائی سے دور تھا، اتفاق سے اس رات کوئی اور حوالاتی نہیں تھا، میں نے چارپائی سے اتر کر گھڑے کی طرف جانا چاہا، مگر چند قدم جانے کے بعد پاؤں کی زنجیر نے روک دیا۔ خیر میں نے کمرے سے باہر ڈیوٹی پر موجود سپاہی کو آواز دی اور انہوں نے بکمال مہربانی مجھے پانی دیا۔

میں نے ایامِ اسیری میں کچھ نظمیں اور اشعار لکھے جو میری پہلی کتاب میں شامل ہیں، ان دنوں میری ایک محبت پورے عروج پر تھی، اس حوالے سے میں نے ایک نظم لکھی جس کی آخری سطریں تھیں۔

دل تو کہتا ہے کہ دو پنکھ لگیں
اور میں اُڑ کر تجھے چھو لوں، لیکن
کیا کروں پاؤں کی زنجیر چھنک جاتی ہے

کچھ عرصہ پہلے ضیاء الحق کا نام نہاد ریفرنڈم ہو چکا تھا، اسی کے پس منظر میں، ایامِ اسیری میں ایک اور مختصر نظم لکھی، جس کا عنوان تھا ''گھناؤنا جرم''

ہمارا جرم اتنا تھا
کہ جس دن شہر بھر میں
سگ شماری ہو رہی تھی

ہم نے اپنا نام

فہرستِ سگاں میں کیوں نہ لکھوایا!

ہمارا جرم اتنا تھا۔۔۔

اتفاق سے عید کا دن بھی مجھے اسی حالت میں گزارنا پڑا، اہلکار مجھے عید گاہ تو لے کر گئے، مگر ہتھکڑی کے ساتھ۔۔۔ عید کے دن میری والدہ محترمہ سے میری ملاقات کرائی گئی۔۔۔۔۔۔ آہ۔۔۔۔۔۔

گھر سے نکلے، تو بس اک ماں کی دعا تھی جیب میں
عمر کے میلے میں پہنچے، تو وہی گم ہو گئی

ooo

چوم لیتی تھی وہ میرے آنسو حسنؔ
میری ماں جیسی کیا کوئی ماں ہوئے گی

خیر 13 دنوں کی اسیری کے بعد میری ضمانت ہو گئی، فراز صاحب ان دنوں جبری جلاوطنی کے سلسلے میں لندن میں تھے، وہاں سے انہوں نے میرے والد صاحب کو خط لکھا کہ مجھے آپ کے بیٹے اور اپنے دوست حسنؔ پر فخر ہے۔

1984ء میں میری کامیاب محبت کے نتیجے میں روبینہ سے میری شادی ہو گئی، بینا خود بھی افسانے لکھتی تھیں اور میری شاعری کی مداح تھیں (اتفاق سے وہ ابھی تک میری شاعری کی بہت مداح ہے) سچ بات تو یہ ہے کہ بینا نے مجھ جیسے لاابالی اور بکھرے ہوئے شخص کو سمیٹ رکھا ہے اور بعض اوقات میری ''تجاوزات'' کو بھی برداشت کرتی ہے۔

میری پہلی کتاب ''خواب عذاب ہوئے'' کی اشاعت بھی بینا کی مرہونِ منت ہے، کہ اس نے اپنا زیور بیچ کر میری کتاب شائع کرائی۔ اس کتاب کا دیباچہ میری محترم دوست اور آپی کشور ناہید نے لکھا اور اس کا فلیپ احمد فراز، افتخار عارف اور سرمد صہبائی نے تحریر کیا تھا۔

1995ء میں میرا دوسرا شعری مجموعہ شائع ہوا ''نیند مسافر'' کتاب کا نام بھی فراز صاحب نے میرے ایک شعر کی بنیاد پر تجویز کیا تھا۔

ہمیں رُسوا کیا، اس نیند میں چلنے کی عادت نے
وگرنہ جاگتے میں ہم کبھی ایسا نہیں کرتے

''نیند مسافر'' کا دیباچہ محترم احمد ندیم قاسمی صاحب نے اور فلیپ فراز صاحب نے لکھا تھا۔ اس دوران میں نے چند اور کتابیں بھی مرتب کیں، جن میں ''پاکستان کے بہترین افسانے''، ''ہندوستان کے بہترین افسانے''، ''فسادات کے افسانے''، ''پاکستان کی بہترین غزلیں''، ہندوستان کی بہترین غزلیں، محبت کی نظمیں''۔

میری تمام کتابیں میرے پیارے دوست آصف محمود نے دوست پبلی کیشنز کے زیر اہتمام شائع کیں۔

اللہ پاک نے مجھے دو بیٹے عطا کیے، فرہاد حسن اور وامق حسن۔ فرہاد ماشاء اللہ پاکستان ایئر فورس میں پائلٹ ہے اور وامق حسن امریکہ سے کمپیوٹر سائنسز میں گریجویٹ ہے۔ وامق Hard of Hearding تھا، سو، اس کے علاج اور تعلیم کے لیے میں 1999ء میں امریکہ چلا گیا، جہاں سے وامق نے تعلیم حاصل کی اور اب وہ ماشاء اللہ پاکستان میں ملازمت کر رہا ہے۔ میں نے امریکہ میں تقریباً دس برس گزارے، مگر سچ تو یہ ہے کہ میں نے امریکہ میں ایک دن بھی نہیں گزارا، میری آنکھیں اور میرا دل اپنے ہی دیس میں بھٹکتے، اپنے پیاروں اور دلداروں کو تلاشتے رہتے تھے۔

میں نے ان گنت محبتیں کیں، مگر یقین کریں ان سب میں میرا خلوص اور جذبہ شامل رہا، شاعر ہونے کے ناطے حسن پرست ہوں، اسی لئے بہت جلد محبت میں ''گرفتار'' ہو جاتا ہوں، میں نے نظمیں بھی بہت لکھیں، مگر رومان پرستی کے زیر اثر غزل میری محبوب صنف ہے۔

چونکہ حُسن پرست ہوں، سو، خوبصورت چہرے، بہت اچھے لگتے ہیں، مگر بقول فراز:

ہر حُسنِ سادہ لوح نہ دل میں اُتر سکا
کچھ تو مزاجِ یار میں گہرائیاں بھی ہوں

بنیادی طور پر لاابالی اور انتہائی درجے کا لاپرواہ ہوں۔ البتہ دو چیزوں میں میرا ڈسپلن اور سنجیدہ پن مثالی ہے ایک تو شاعری، جو کہ میرا پہلا اور آخری عشق ہے اور دوسرا لباس کے معاملے میں، اپنے تئیں بہت خوش لباس ہوں (احباب بھی یہی کہتے ہیں) سارا دن ہنستا ہوں، لطائف سنتا، سناتا ہوں، Non

Serious رہتا ہوں، موسیقی سے بہت دلچسپی ہے، سنگر تو نہیں ہوں مگر تھوڑا سا موسیقی کو سمجھنے کی وجہ سے گنگنا لیتا ہوں۔ مجھے PNCA میں Job بھی ایسی ملی، یعنی ڈائریکٹر پرفارمنگ آرٹس (میوزک، ڈانس، ڈرامہ) سو، بہت ذوق شوق سے اپنی ذمہ داری نبھائی۔

محبتیں تو بہت سی کی ہیں اور دھوکے بھی کھائے ہیں مگر کسی کو دھوکہ دیا نہیں۔

میں نے جس جس کو بھی چاہا ہے، بہت چاہا ہے
تم کسی ایک سے تصدیق کرا سکتی ہو

مجھے چھوٹے بچوں سے، پھولوں سے، خوشبو سے، تتلیوں سے، جگنوؤں سے اور پیار سے بہت پیار ہے۔ اب بھی تتلیاں دیکھ کر دل مچل اٹھتا ہے، جہاں میں رہتا ہوں، وہاں جگنو کم نظر آتے ہیں مگر جب دکھائی دیں تو انہیں چھونے کو دل چاہتا ہے۔ رات دیر تک جاگنا اور چاندنی رات میں خود کلامی اچھی لگتی ہے، جب بھی سمندر دیکھتا ہوں، اس سے مکالمہ کرنا اچھا لگتا ہے۔ چھوٹے بچوں سے پیار کے حوالے سے موہن سنگھ کا ایک شعر بہت یاد آتا ہے۔

بچے جیہا نہ میوہ ڈٹھا
جتنا کچا، اُتنا مٹھا

میں نے اوپر کہیں لکھا ہے کہ میں انتہائی غیر سنجیدہ ہوں، ہر وقت ہنسنا، جملے بازی کرنا، مذاق کرنا میری عادت ہے، شاید اس کی وجہ نفسیاتی ردعمل ہو کہ میں نے دکھ بھی بہت اٹھائے ہیں، محفلوں میں ہنستا ہوں مگر تنہائی میں خود کو گلے لگا کر بہت روتا ہوں۔

خود کو گلے لگا کر رونے کا نشہ ہے
وہ جو نہیں ہے، اُسی کے ہونے کا نشہ ہے
درد کسی کا بھی ہو، رونے ہم لگتے ہیں
ہمیں تو جیسے آنکھ بھگونے کا نشہ ہے

میں نے اوپر تلے 3 جوان بھائیوں اور والدہ کے جنازے اپنے کاندھے پر اٹھائے ہیں۔

دل اپنے کشادہ تھے
اس لئے رونا پڑا
ہم ہنستے زیادہ تھے

کوئی رونے نہیں دیتا
دکھ اتنے جنازوں کا
ہمیں سونے نہیں دیتا

مجھے خواہشِ مرگ تو نہیں، مگر احساسِ مرگ اچھا لگتا ہے، شاید اسی لئے لاشعوری طور پر میری شاعری میں متعدد مقامات پر موت کا حوالہ ملتا ہے، ممکن ہے میں موت کو کچھ زیادہ ROMANTICISE کرتا ہوں، جن دنوں آمریت کے خلاف قلمی جہاد کرتے ہوئے مارشل لاء کے تحت گرفتار ہوا، تو خیال آیا تھا کہ ہوسکتا ہے بغاوت کے جرم میں یہ لوگ مجھے آخری درجے کی سزا سنادیں، ویسے ایک بات کہہ دوں، مجھے پھانسی کے پھندے سے جھولنا اچھا لگتا ہے۔ خیر آپ اسے بھی میرا آئیڈیلزم کہہ سکتے ہیں۔

آپ جان سکتے ہیں کہ کوئی بھی فنکار جب اپنا خوبصورت فن پارہ تخلیق کرتا ہے تو اس کو ایسی سرشاری ملتی ہے، جس کے سامنے دنیا کی نعمتیں ہیچ لگتی ہیں اور اگر اس فن پارے کو قارئین اور سامعین کی داد بھی مل جائے تو اس کی سرشاری کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ میں نے بے شمار ملکوں کے دورے بھی کیے اور بین الاقوامی مشاعرے بھی پڑھے، بے پناہ داد ملی۔ مگر ایک کمال کی داد میں کبھی نہیں بھول سکوں گا۔ کچھ عرصہ قبل میں آزاد کشمیر کے شہر عباس پور میں مشاعرہ پڑھنے گیا۔ صدر مشاعرہ بھی میں تھا، جیب میں موجود لکھی غزلیں پڑھ کر، دوبارہ جیب میں رکھ رہا تھا کہ اس دوران مجھے ہال سے کسی نے ایک چٹ بھیجی، لکھا تھا: "آپ اپنی شاعری کے تمام کاغذات ہمارے حوالے کردیں، ورنہ ہم آپ کو شہر سے نکلنے نہیں دیں گے" مجھے یہ "دھمکی" بہت اچھی لگی، اور میں نے یہ چٹ آج بھی سنبھال کر رکھی ہوئی ہے۔

ایک بات اور، لاہور کے ایک نوجوان ہیں احمد مسعود، میں ان سے کبھی نہیں ملا، اتفاق سے ان کو میری شاعری اچھی لگتی ہے۔ انہوں نے میری کتب، ویب سائٹ اور فیس بک سے میری شاعری کا انتخاب کرکے مجھے بھیجا تھا، جو اس کتاب کے آخر میں شامل کررہا ہوں کہ جن احباب تک میری پہلی

کتابیں نہیں پہنچ سکیں، وہ احمد مسعود کے منتخب اشعار کے ذریعے کتابوں سے آشنا ہو سکتے ہیں۔ اپنے دیرینہ دوست اور ناروے میں مقیم مسعود منور کا ممنون ہوں کہ انہوں نے عشق بدوش کا پیش لفظ تحریر کیا اور محترم شمیم حنفی (بھارت) کا بے حد شکریہ کہ انہوں نے کتاب کا فلیپ لکھا۔

عزیز دوستو، زندگی کا بھلا کیا اعتبار ہے، سو ہر تحریر کو آخری تحریر سمجھتا ہوں، لہٰذا بقول فیض صاحب

ہم خستہ تنوں سے محتسبو، کیا مال منال کا پوچھتے ہو
جو عمر سے ہم نے بھر پایا، سب سامنے لائے دیتے ہیں
دامن میں ہے مشتِ خاکِ جگر، ساغر میں ہے خونِ حسرتِ مے
لو ہم نے دامن جھاڑ دیا، لو جام اُلٹائے دیتے ہیں

سو، جو کچھ ذہن میں آیا قلم برداشتہ ایک ہی نشست میں لکھ کر آپ کے سامنے رکھ دیا۔

گر قبول افتد، زہے عز و شرف

حسن عباس رضا

اسلام آباد

O

تُو بہت روئے گی، لیکن میں جُدا ہو جاؤں گا
زندگی، اک روز میں تجھ سے خفا ہو جاؤں گا

آخری سیڑھی پہ جا کر تُو پکارے گی مجھے
اور میں نیچے کھڑا تیری صدا ہو جاؤں گا

تُو مصلّے پر مری نیّت تو باندھے گی، مگر
میں نمازِ عشق ہُوں، تجھ سے قضا ہو جاؤں گا

چاہتوں کے دائرے میں آؤ دوڑیں ایک ساتھ
تُو نے مجھ کو چھو لیا، تو میں ترا ہو جاؤں گا

خود کو اک دن بانٹ دوں گا دشمنوں کے درمیاں
کم سے کم قیدِ انا سے تو رہا ہو جاؤں گا

سانپ اور سیڑھی کے اُلجھے کھیل میں اک روز میں
درمیانی مرحلے میں لاپتا ہو جاؤں گا

میں جسے کرتا رہا اپنی دعاؤں میں شمار
کیا خبر تھی میں اُسی کی بددُعا ہو جاؤں گا

بے وفائی کا دیا اُس نے حسنؔ طعنہ مجھے
اور اب میں احتجاجاً بے وفا ہو جاؤں گا

○

ماضی بھی میرے ساتھ ہی پلٹا رہا، تو پھر؟
میں تیرا ہو کے بھی، نہ ترا ہوسکا، تو پھر؟

تم مطمئن تو ہو مجھے میلے میں بھیج کر
اس بھیڑ میں کہیں میرا دل لگ گیا، تو پھر؟

گھر تو بنا رہی ہو مرے گھر کے سامنے
تم کو کسی نے چھت پہ نہ جانے دیا، تو پھر؟

سب جانتے ہیں کس طرح ٹوٹا ہُوں تیرے بعد
یہ سانحہ دوبارہ ہُوا رونما، تو پھر؟

خواہش تو ہے کہ ایک نیا بُت بناؤں میں
وہ بُت بھی ہُو بہو تیرے جیسا بنا، تو پھر؟

تم سے کہا تھا آنکھ میں رکھنا سنبھال کر
الماریوں سے خواب کوئی لے اُڑا، تو پھر؟

رکھا ہے دل کی ساتویں تہہ میں جو رازِ عشق
تم سے کسی نے وہ بھی اُگلوا لیا تو پھر؟

کہہ تو رہی ہو چھوڑنے جاؤں گی موڑ تک
خود پر بھی اُس گھڑی نہ ترا بس چلا، تو پھر؟

تم آگ لا رہی ہو، کہ کچھ روشنی کریں
اس کھیل میں تمہارا حسن جل مرا، تو پھر؟

○

گزشتہ شب میری آنکھوں میں خواب تھا ہی نہیں
اور ایسی نیند سے بڑھ کر عذاب تھا ہی نہیں

ہمیں تو دُکھ ہی پڑھایا گیا ہے مکتب میں
کہ دوسرا وہاں کوئی نصاب تھا ہی نہیں

کچھ اتنے رشک سے تکتے ہیں گل فروش تجھے
کہ جیسے باغ میں تجھ سا گلاب تھا ہی نہیں

غموں کو گِنتے ہوئے ختم ہو گئی گِنتی
مرے حساب میں اُن کا حساب تھا ہی نہیں

گلی کے لوگ مجھے ایسے دکھ سے دیکھتے ہیں
کہ جیسے دوسرا خانہ خراب تھا ہی نہیں

اچانک اُس نے کچھ ایسے سوال پوچھ لیے
کہ میرے پاس کسی کا جواب تھا ہی نہیں

بھری ہوئی ہے لبالب اُنہی کے ساغر میں
حسنؔ جنہیں کبھی ذوقِ شراب تھا ہی نہیں

○

آنکھ سے پھر نہ بہے گا دلِ برباد کا دکھ
جب پری زاد سمجھ لے گی اَنا زاد کا دکھ

یاد کرتا ہوں تو ، تارِ رگِ جاں ٹوٹتی ہے
مار ڈالے گا کسی روز تری یاد کا دکھ

تختِ پرویز سے وابستہ تھا سُکھ شیریں کا
کیسے کر سکتی تھی محسوس وہ فرہاد کا دکھ؟

نسل در نسل دکھوں کو کیا تقسیم ، مگر
ختم ہونے کو نہیں آتا ہے اجداد کا دکھ

گھر میں رہ جاتے ہیں بس ڈوبتے سائے باقی
ورنہ ماں باپ کو کھا جاتا ہے اولاد کا دکھ

بہہ نکلتا ہے حسنؔ آنکھ سے دجلہ اکثر
بھولتا ہی نہیں بربادیٔ بغداد کا دکھ

O

یوں اچانک وہ آ مِلا مجھ سے
عشق میں شِرک ہو گیا مجھ سے

درمیاں رکھ کے فاصلے کی دلیل
لے لیا اُس نے فیصلہ مجھ سے

کچھ بھی باقی رہا نہ پھر مجھ میں
مجھ کو ایسے الگ کیا مجھ سے

رنج پھر دل کو روندنے آیا
پھر یہ مانگے گا راستا مجھ سے

کوئی تفتیش کار ، تیرے سوا
کچھ برآمد نہ کر سکا مجھ سے

اک دیئے کو پناہ کیا دی ہے !
آندھیاں ہو گئیں خفا مجھ سے

اپنے ہمزاد سے رجوع کیا
تُو ہُوا جب گریز پا مجھ سے

اپنا غم ہی تھا مسئلہ میرا
جو کبھی حل نہیں ہُوا مجھ سے

کل بڑے دکھ سے آئنے نے کہا
کب ملو گے حسنؔ رضا مجھ سے ؟

○

دل نے بھی کہہ دیا خدا حافظ
زندگی ، اب ترا خدا حافظ

تیری مٹی بُلا رہی ہے تجھے
اپنا ساماں اُٹھا ، خدا حافظ

روشنی تک تھا میں ترا مہمان
اب جلا لے دِیا ، خدا حافظ

میں نے خوش آمدید کہنا تھا
اُس نے جھٹ سے کہا ، خدا حافظ

کشتی جاں ترے حوالے ہے
جا مرے ناخدا ، خدا حافظ

فیصلے کی گھڑی ہے آج کی شام
چل مرے ساتھ ، یا ، خدا حافظ

مشہدِ عشق سے بلاوا تھا
دل پکارا ، کہ جا خدا حافظ

فون میں نے کیا ، کب آؤ گے؟
میسج آیا رضاؔ خدا حافظ

○

عین اُس گھڑی بدن سے ہوئی جان الوداع
جب ہو رہا تھا آخری مہمان الوداع

دنیا سمٹ کے آنکھ کی پتلی میں آ گئی
میں اپنے آپ سے ہُوا جس آن الوداع

اب کس سے روٹھنا ہے، منائے گا آ کے کون؟
اس بار ہو گیا ہے مرا مان الوداع

بلقیس نے بھی اوڑھ لی چادر فراق کی
جس شب ہوئے سبا سے سلیمان الوداع

تب یہ کُھلا ، خدا بھی تمہارا ، خدائی بھی
جب مسجدوں سے بھی ہُوا اعلان ، الوداع

الماریوں میں بند مِرے خواب تھے حسنؔ
میں ہو رہا تھا بے سروسامان الوداع

○

کیوں شہرِ جاں سے نقل مکانی نہ کر سکے
تجھ سے بھی ہم بیاں یہ کہانی نہ کر سکے

ہجراں کی برف شیشہء دل پر جمی رہی
کوشش تو کی ، مگر اسے پانی نہ کر سکے

جس طور تُو نے کی ہے معطر شبِ وصال
ممکن ہے ویسا رات کی رانی نہ کر سکے

یوں کھو گئے تھے اُس کے طلسمِ جمال میں
ہم خدوخال یاد زبانی نہ کر سکے

اب کے برس کچھ اتنی عزاداریاں ہوئیں
سکتے میں تھے، سو مرثیہ خوانی نہ کر سکے

اُس نے کہا تھا آؤ حسنؔ خودکشی کریں
میں نے ہی اُس کی بات نہ مانی، نہ کر سکے

○

آخری عشق ہے، جاں لیوا ہو سکتا ہے
حسن ، یہ اک خودکُش حملہ ہو سکتا ہے

آئنے میں اک عکس جو اکثر دیکھتا ہوں
میرا نہیں تو ، پھر کس کا ہو سکتا ہے؟

اُلجھا ہوں میں اپنے آپ سے پہلی بار
کبھی نہ سوچا تھا ایسا ہو سکتا ہے

دھمکی سمجھو یا پھر ردِ جفا کہہ لو
فیصلہ دل کا ترکِ وفا ہو سکتا ہے

شہر میں کون زیادہ چاہتا ہے اُس کو ؟
اتنی بات پہ بھی بلوہ ہو سکتا ہے

کسے گماں تھا ایک تری انگشتری سے
سونا اتنا بھی مہنگا ہو سکتا ہے

آخری دستک ہے، اب آ کر دیکھ تو لے
در پہ تمہارے حسن رضاؔ ہو سکتا ہے

○

یہ سوچ رکھا ہے اب اُسے غم نہیں بتانا
کیا تھا کل رات کس کا ماتم ، نہیں بتانا

بتا تو سکتا ہوں زخم کس نے لگائے ، لیکن
لگایا زخموں پہ کس نے مرہم ، نہیں بتانا

تری محبت مرے لہو میں اُتر چکی تھی
ہوئی اچانک یہ کس طرح کم ، نہیں بتانا

وہ باتوں باتوں میں تم سے پوچھے گی میری باتیں
وہ چاہے تم پہ ہو لاکھ برہم ، نہیں بتانا

نہیں بتانا کہ اتنے آنسو بہے تھے کیسے ؟
نہیں بتانا، خدا را جانم ، نہیں بتانا

حسن، وہ روتے ہوئے کریدے گی دکھ تمہارے
برسنے دینا وہ آنکھ چھم چھم ، نہیں بتانا

○

اک آس پہ رکھ لیتا ہے ، مرنے نہیں دیتا
یہ عشق مجھے خودکشی کرنے نہیں دیتا

دریا بھی اُسی کا ہے ، کنارے بھی اُسی کے
لیکن مجھے پانی میں اُترنے نہیں دیتا

رکھتا ہے ہمیشہ وہ مری پیاس اُدھوری
خواہش کا کٹورا کبھی بھرنے نہیں دیتا

عیار ہے اتنا ، کہ مرے شعر سُنا کر
مجھ کو کسی وعدے سے مُکرنے نہیں دیتا

ہر موڑ پہ آنکھوں کے بٹھا دیتا ہے پہرے
اِک پل بھی گلی میں وہ ٹھہرنے نہیں دیتا

سب آئنہ خانوں پہ اُسی کی ہے حکومت
جُز اپنے ، کسی کو بھی سنورنے نہیں دیتا

آوارگی [1] جاری ہے حسنؔ آج بھی، لیکن
اک شخص مجھے حد سے گزرنے نہیں دیتا

1۔ اپنی غزل "آوارگی میں حد سے گزر جانا چاہیے" سے استفادہ کرتے ہوئے۔

O

چراغِ جاں بہت بھڑکے گا بُجھنے سے ذرا پہلے
سو، تم بھی لوٹ جانا میرے کمرے سے ذرا پہلے

کہیں ایسا نہ ہو تم چاند کی نظروں میں آ جاؤ
نکلنا شام کے پہلے ستارے سے ذرا پہلے

پھر اُس کے بعد تو اک موج مجھ کو لے گئی ، ورنہ
عجب تھا خوف دریا میں اُترنے سے ذرا پہلے

تکلف برطرف ، جب پیاس چمکے تو چلے آنا
میں دروازہ کُھلا رکھوں گا، پینے سے ذرا پہلے

○

حقیقت میں مجھے ہمزاد سے ڈر لگ گیا ہے
کہ اُس کے قتل کا الزام مجھ پر لگ گیا ہے

نہ میں نے ایڑیاں رگڑیں، نہ میری پیاس روئی
نہ جانے کیوں تعاقب میں سمندر لگ گیا ہے؟

ذرا سی دیر میں ہو جائے گا دیدار اُس کا
کہ کچھ پہلے سرہانے سے مرا سر لگ گیا ہے

ترے ہوتے ہوئے ہیرا تھا، پتھر ہو گیا ہوں
میں سمجھا تھا، مجھے سُرخاب کا پَر لگ گیا ہے

کبھی ملنا جو چاہو تو، پتا آسان ہے میرا
بہت چھوٹا سا گھر ہے، تیرے بنگلے سے ذرا پہلے

میں تجھ تک نیند میں چلتے ہوئے آ جاؤں گا، لیکن
مجھے واقف تو ہو جانے دو رستے سے ذرا پہلے

کہیں ایسا نہ ہو اُس بھیڑ میں تم پھر بھٹک جاؤ
سو، خود کو سونپ دینا مجھ کو، میلے سے ذرا پہلے

حسنؔ، میں اس لیے گھوما ہوں شب بھر بائیں ایڑی پر
کہ وہ تالی بجا دیتی تھی گرنے سے ذرا پہلے

○

حقیقت میں مجھے ہمزاد سے ڈر لگ گیا ہے
کہ اُس کے قتل کا الزام مجھ پر لگ گیا ہے

نہ میں نے ایڑیاں رگڑیں، نہ میری پیاس روئی
نہ جانے کیوں تعاقب میں سمندر لگ گیا ہے؟

ذرا سی دیر میں ہو جائے گا دیدار اُس کا
کہ کچھ پہلے سرہانے سے مرا سر لگ گیا ہے

ترے ہوتے ہوئے ہیرا تھا، پتھر ہو گیا ہوں
میں سمجھا تھا، مجھے سُرخاب کا پَر لگ گیا ہے

کبھی جس کو میسّر تھا نہ مٹی کا کٹورا
اب اُس کے ہاتھ اِک شیشے کا ساغر لگ گیا ہے

پہنچ جاتا تھا جس گھر نیند میں چلتے ہوئے مَیں
حسنؔ اب کے کرائے پر وہی گھر لگ گیا ہے

○

عشق کو جب سے حسن پر کیا ہے میں نے
اپنے ہر خواب کو تعبیر کیا ہے میں نے

پھر نہ اُٹھ جائیں مرے پاؤں ترے گھر کی طرف
احتیاطاً انہیں زنجیر کیا ہے میں نے

غم نہیں یہ کہ میں خود ٹوٹ گیا ہوں کتنا !
دکھ تو یہ ہے ، تجھے دلگیر کیا ہے میں نے

اب میں اُتروں گا تری آنکھ میں زینہ زینہ
ایسے ڈھب سے تجھے تسخیر کیا ہے میں نے

ایک ہی شہرِ تمنا تھا مرے خوابوں میں
اور ترا گھر وہیں تعمیر کیا ہے میں نے

اُس نے جو کچھ بھی حسنؔ آخری میسج میں لکھا
اُسی احساس کو تحریر کیا ہے میں نے

○

تجھ سے دُوری کا مداوا نہیں کر سکتا میں
دکھ تو یہ ہے تجھے اغوا نہیں کر سکتا میں

تُو مجھے بھول کے خوشیوں میں مگن ہو جائے !
یہ سہولت تو مہیا نہیں کر سکتا میں

وہ جو رُت چھوڑ گئی ہے مجھے تنہا کر کے
اب تو اُس رُت کا بھی پیچھا نہیں کر سکتا میں

دل تو اُکساتا ہے مَیں تجھ سے بغاوت کر دوں
جانتا بھی ہے کہ ایسا نہیں کر سکتا میں

عشق میں رنج زیادہ ہیں ترے یا میرے؟
فیصلہ اس کا اکیلا نہیں کر سکتا میں!

بھولنے کی تجھے کوشش تو کروں گا پوری
لیکن اِس بات کا وعدہ نہیں کر سکتا میں

خود کو تقسیم حسنؔ تیس برس تک کر کے
تیس دن میں تو اکٹھا نہیں کر سکتا میں

O

حسد مجھ سے اگر کرنے لگے ہیں یار میرے!
تو پھر کس کام کے یہ گیت اور اشعار میرے؟

مرے کچھ تجگے ، کچھ خواب رہنے دو یہاں پر
اُٹھا لے جاؤ سارے درہم و دینار میرے

تمہیں آتی نہیں ہے ایک سے دس تک کی گنتی
کہاں تم گِن سکو گی اَن گنت آزار میرے

میں خود کو بھول آیا تھا تمہاری خواب گہ میں
جو ممکن ہو تو بھجوا دو مجھے ، دلدار میرے

میں کن بے مہر شہروں میں بھٹکتا پھر رہا تھا
صدائیں دے رہے تھے جب در و دیوار میرے

حسن ، یہ جسم اور آنکھیں تو پاکستان میں ہیں
مگر دل اور سپنے رہ گئے اُس پار میرے

○

وہ دل میں ٹھان کے آیا ہے گھر سے آتے ہوئے
کہ میرے خواب بھی لے جائے گا وہ جاتے ہوئے

اگر وہ دل مرا تسخیر کرنا چاہتا ہے
تو مجھ میں آئے ، مجھے راہ سے ہٹاتے ہوئے

بُرے بھلے کا اُسے فرق ہی نہیں معلوم
کہیں وہ گھر نہ جلا دے ، دِیا جلاتے ہوئے

بلا کا ضبط ہے اُس میں ، مگر یہ شک بھی ہے
کہ رو پڑے گا مجھے حالِ دل سناتے ہوئے

کسی صدا کا دلاسہ گرا نہ کاسے میں
میں تھک گیا ہوں درِ یار کھٹکھٹاتے ہوئے

اس اعتماد سے وہ شخص جھوٹ بولتا ہے
کہ اُس کی مانتا جاتا ہوں مسکراتے ہوئے

نہ جانے کیوں مجھے یہ وہم ہو گیا ہے حسنؔ
کہ کاٹ دے گا گلا ، وہ گلے لگاتے ہوئے

○

ٹو نے ڈالا ہے جسم و جاں میں نفاق
عاشقی ، تجھ کو تین بار طلاق

دل بہت احتجاج کرتا تھا
کر دیا جائیدادِ جسم سے عاق

چشمِ گستاخ مجھ سے پوچھے بغیر
کر گئی تیری آنکھ سے الحاق

پھر سے داخل ہُوا ہوں مکتب میں
بھول بیٹھا تھا عشق کے اسباق

دل کے جغرافیے کی کاپی میں
اب بھی خالی پڑے ہیں کچھ اوراق

وصل تو خیر ایک نعمت تھی
مجھ کو راس آ گیا ہے تیرا فراق

سادہ کاغذ پہ دستخط لے کر
زندگی نے حسن کیا بیباق

○

کیا کہوں کیسی اذیّت سے گزر کر آیا
روند کر اپنی انا جب میں ترے گھر آیا

تشنگی نے کئی دریاؤں کے قاصد بھیجے
تب کہیں جا کے مِرے در پہ سمندر آیا

کچھ دلاسے مِرے کاسے میں پڑے تھے، پھر بھی
اپنا انکار مَیں چوکھٹ پہ تری دھر آیا

وصل کی شب بھی کسی لَے پہ نہیں اُترا وہ
تال سے تال مِلائی ، نہ وہ سَم پر آیا

خواب در خواب پھر اُتری وہ مری آنکھوں میں
جوں ہی کل رات کو تکیے پہ مرا سر آیا

حرف گر آئے بہت شہرِ سخن میں ، لیکن
میرؔ و غالبؔ سا نہ پھر کوئی سخن ور آیا

اُس نے تاوان میں مانگی ہے حسنؔ نیند مری
مر ہی جاؤں گا ، اگر خواب سے باہر آیا

○

ہونا ہے اب جو پیش ہمارے، وہ ہو رہے
ہم کارِ عشق ملتوی کرنے سے تو رہے

تُو نے تو ہم کو آنکھ بدر کر دیا، مگر
رہنا تو تھا ہمیں ترے خوابوں میں، سو، رہے

زینہ اُترتی شام سے کی ہے یہ التجا
دالانِ خواب میں بھی وہ کچھ دیر کو رہے

ہم خود تو جل بجھے ہیں، مگر اِس دعا کے ساتھ
اُونچی سدا چراغِ تمنا کی لو رہے

ہم نے تو رتجگوں سے کیا ہے معاہدہ
جو اِس سے متفق نہیں ، وہ جائے ، سو رہے

شاید وہ کشتگانِ انا تھے حسن رضاؔ
روزِ ازل اپنے مقابل ہی جو رہے

○

تلاشنا تھا مجھے تیسرے کنارے کو
سو، میں نے ساتھ لیا شام کے ستارے کو

ترے بہاؤ میں ہوتا رہا کٹاؤ مرا
کہ روک پایا نہ تیری اَنا کے دھارے کو

اُتر کے آ تو گیا ہوں میں سیڑھیاں، لیکن
پلٹ کے دیکھ رہا ہوں ترے چوبارے کو

میں تیری آنکھ کا صدقہ اُتار آیا ہوں
کہ تُو بھی دیکھ سکے ڈوبتے نظارے کو

جو رتجگے بھری آنکھوں سے لے گئے سپنے
وہ ڈھونڈتے ہیں تری نیند کے دوارے کو

اسی لیے تو دکاں بند کی ہے خوابوں کی
کہ دکھ بھی گھیر چکے تھے بھرے خسارے کو

وہ کہہ رہی تھی حسنؔ ہجر ایک نعمت ہے
میں سادہ دل نہیں سمجھا تھا اِس اشارے کو

○

کسی کو کیا غرض سو بار کے دیکھے تماشے سے؟
گِرا پردہ، کہ ہم اُکتا گئے تیرے تماشے سے

عجب کیا، وقت لے آئے تماشا گاہ میں اُن کو
جو خود کل تک بہت محظوظ ہوتے تھے تماشے سے

تماشا گشت و خوں کا ہم سے اب دیکھا نہیں جاتا
تمہارا حوصلہ ہے! تم نہیں تھکتے تماشے سے!

کچھ اتنی حیرتیں ہیں اب تماشہ گر کی آنکھوں میں!
کہ اُس کو خوف سا آنے لگا اپنے تماشے سے

O

نگارِ شہرِ تمنّا ، مجھے اجازت دے
میں چھوڑ دوں تری دنیا ، مجھے اجازت دے

میں انتظار میں کب سے کھڑا ہوں زینے پر
لگا لے مجھ کو گلے، یا مجھے اجازت دے

ارادہ ترکِ تعلّق کا ہے ، تو بسم اللہ
تُو ہاتھ کھینچ لے ، ورنہ مجھے اجازت دے

محبتوں میں کہاں بھاؤ تاؤ ہوتا ہے ! ؟
نہ ہو سکے گا یہ سودا ، مجھے اجازت دے

ذرا سی روشنی بھی ہو، تو آنکھیں دُکھنے لگتی ہیں
کہ ہم مانوس اتنے ہو گئے کالے تماشے سے

وہ اپنی بات منوانے سے پہلے خوب روتی ہے
مجھے اکثر پڑا ہے واسطہ ایسے تماشے سے

حسنؔ، میں اس لیے بھی گھومتا رہتا ہوں ایڑی پر
کہ وہ سرشار ہوتی ہے بہت میرے تماشے سے

○

نگارِ شہرِ تمنا ، مجھے اجازت دے
میں چھوڑ دوں تری دنیا ، مجھے اجازت دے

میں انتظار میں کب سے کھڑا ہوں زینے پر
لگا لے مجھ کو گلے، یا مجھے اجازت دے

ارادہ ترکِ تعلق کا ہے ، تو بسم اللہ
تُو ہاتھ کھینچ لے ، ورنہ مجھے اجازت دے

محبتوں میں کہاں بھاؤ تاؤ ہوتا ہے ! ؟
نہ ہو سکے گا یہ سودا ، مجھے اجازت دے

نمازِ عشق بھی کل ہو گئی تھی مجھ سے قضا
بچھاؤں اب میں مصلاً ، مجھے اجازت دے

اسی گلی میں کہیں اُس کا گھر بھی ہوتا تھا
میں دیکھ لوں ذرا نقشہ ، مجھے اجازت دے

کبھی تجھے بھی ضرورت پڑی اجازت کی
تو پھر حسنؔ سے نہ کہنا ، مجھے اجازت دے

○

جب فرشِ طلب سے آئے صدا ، آ رقص کریں
پھر سوچنا کیا ، شرمانا کیا ؟ آ رقص کریں

ممکن ہے کہ پھر میں آ نہ سکوں اس آنگن میں
رکھ ٹھوکر پر دیوارِ انا ، آ رقص کریں

جب نیند میں چلتے زینۂ وصل سے اُترا میں
اک سایہ مجھ سے کہنے لگا ، آ رقص کریں

میں دکھ کی اذیّت کم کرنے آیا ہوں یہاں
تُو درد کی تال سے تال مِلا ، آ رقص کریں

دن گھنگھرو جیسے ، اور شامیں پازیب سی ہیں
اب تُو بھی تھام لے ہاتھ مرا ، آ رقص کریں

اک وعدہ کاسۂ خواہش میں جس وقت گرا
درویشِ محبت مچل گیا ، آ رقص کریں

جب جسم میں خواہش جاگے گی ، لہرانے کی
تم خود ہی کہو گی حسن رضاؔ ، آ رقص کریں

○

تھا بہت ناز جس کہانی پر
میں نے لکھ دی وہ بہتے پانی پر

اپنی آنکھوں کو کر دیا مامور
تیرے خوابوں کی میزبانی پر

میں نے راضی کیا محبت کو
قریہء جاں کی حکمرانی پر

اُس زباں میں بھی آ گئی لکنت
زعم تھا جس کو خوش بیانی پر

مرثیہ خواں بھی کر لیے مدعو
رحلتِ دل کی نوحہ خوانی پر

مرشدِ عشق ہی کا راج رہے
اب حسن دل کی راجدھانی پر

○

وادیٔ جاں میں اُتر ، دل میں سما ، بسم اللہ
یہ ترا گھر ہے ، بڑے شوق سے آ ، بسم اللہ

شہر کا شہر تجھے دیکھنے آجائے گا
ہر طرف سے یہی آئے گی صدا ، بسم اللہ

اَن گنت عشق کیے میں نے ، مگر سچ یہ ہے
تجھ کو دیکھا تو مرے دل نے کہا ، بسم اللہ

عین ممکن ہے ترا پیار اَمر ہو جائے
بس یہی سوچ کے تُو ہاتھ بڑھا ، بسم اللہ

اتنی دُوری سے کہاں پیاس بجھے گی تیری !
میرے پاس آ، مجھے ہونٹوں سے لگا، بسم اللہ

اِسی امید پہ بیٹھا ہُوں میں دہلیز کے پاس
تُو کسی روز بُلائے گی کہ آ ، بسم اللہ

نیند میں چلتے ہوئے جب ترے گھر آؤں گا
تُو نے بس اتنا ہی کہنا ہے رضا ، بسم اللہ

○

اُن کو نہیں شعور کہ وہ کیا خرید لائے
دینارِ عشق دے کے جو دنیا خرید لائے

ممکن ہے مل ہی جائے ترا گھر، تری گلی
اس جستجو میں شہر کا نقشہ خرید لائے

بازارِ جاں میں مہنگا بہت تھا گُلِ مراد
ارزاں تھی صرف شاخِ تمنا، خرید لائے

پہلے تو خود کو رکھ دیا گروی دکان پر
پھر جو پسند یار کو آیا، خرید لائے

اپنی تماشبین طبیعت کے شوق میں
دیکھا جہاں بھی کوئی تماشا، خرید لائے

پہلے تو خود کو بیچ دیا کوڑیوں کے مول
مانگا دوبارہ اُس نے، تو مہنگا خرید لائے

قسطوں میں مِل رہا تھا حسن وعدۂ وصال
ہم بھاؤ تاؤ کر کے اکٹھا خرید لائے

خواہش وصال پر بہت زور ہے
بلکہ اس کتاب کی
یہی خصوصیت معلوم ہوتی
ہے۔

O

مکان عشق نے ایسی جگہ بنا لیا تھا
کہ مجھ کو گھر سے نکلتے ہی اُس نے آ لیا تھا

میں جانتا تھا کہ ضدّی ہے پرلے درجے کی
سو، ہار مان کے میں نے اُسے منا لیا تھا

خبر ملی مجھے جیسے ہیَ اُس کے آنے کی
نگاہ در پہ رکھی ، اور دِیا جلا لیا تھا

جو دل کا حال تھا ہم نے بڑے سلیقے سے
غزل بہانہ کیا ، اور اُسے سُنا لیا تھا

اک ایسی بات حسنؔ کہہ دی آئنے نے مجھے
کہ، اُس کو توڑ کے، خود کو گلے لگا لیا تھا

○

شام کی آخری پرواز سے آ سکتی ہو
تم مرے شہر سے ہو کر بھی تو جا سکتی ہو

فون کرنے میں جھجک ہے تو مجھے میسج میں
آمد و رفت کے اوقات بتا سکتی ہو

بے وفائی میرا شیوہ تو نہیں ہے، پھر بھی
مجھ پہ ہرجائی کا الزام لگا سکتی ہو

میں نے جس جس کو بھی چاہا ہے، بہت چاہا ہے
تم کسی ایک سے تصدیق کرا سکتی ہو

کل میں اک خواب تری آنکھ میں بھول آیا تھا
کیا تم اُس خواب کا انجام بتا سکتی ہو ؟

خود ہی تم نے تو گنوایا تھا حسن میلے میں
اور اب تم ہی اُسے ڈھونڈ کے لا سکتی ہو

O

قرض پر نیند لیے کل سے جو سویا ہُوا ہے
نو برس تک یہ ترے ہجر میں رویا ہُوا ہے

میں تجھے چھو کے ترا ورد کیا کرتا ہوں
تجھ کو تسبیح کے دھاگے میں پرویا ہُوا ہے

رتجگوں سے بھی کبھی اُس کی شناسائی تھی
اب جو خوابوں کے مضافات میں کھویا ہُوا ہے

جانے کتنی ہی دلیلوں سے منایا تھا اُسے
تب کہیں جا کے مرے حق میں وہ گویا ہُوا ہے

رنج کے پھول ہی کھلتے ہیں مرے آنگن میں
ایسا لگتا ہے کہ دل خاک میں بویا ہُوا ہے

اُس کی یادوں سے حسنؔ باندھ کے بھاری پتھر
درد کی کاسنی جھیلوں میں ڈبویا ہُوا ہے

○

عشقِ اوّل کبھی اس دل سے نہیں نکلے گا
یہ تری روز کی کِل کِل سے نہیں نکلے گا

اب جو آبیٹھا ہے آسیبِ محبت مجھ میں
کسی مرشد، کسی عامل سے نہیں نکلے گا

جتنی آسانیاں ممکن تھیں، فراہم کی ہیں
پھر بھی یہ دل کبھی مشکل سے نہیں نکلے گا

میں سمرقند و بخارا[1] بھی اگر دے دوں اسے
ایسا کم بخت ہے اُس تِل سے نہیں نکلے گا

کل بڑے کرب سے کہنے لگا آئینہ مجھے
تُو حسنؔ غم کے مراحل سے نہیں نکلے گا

---

(۱)۔ اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دلِ مارا "بخالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را"

○

تم کو خود سے کبھی منہا نہیں ہونے دوں گا
کچھ بھی ہو جائے ، میں ایسا نہیں ہونے دوں گا

تم کسی وقت بھی میلے میں بھٹک سکتے ہو
میں تمہیں بھیڑ میں تنہا نہیں ہونے دوں گا

رات میں نے دلِ گستاخ کو سمجھایا ہے
اب تمہیں اور کسی کا نہیں ہونے دوں گا

عین ممکن ہے وہ تاوان میں نیندیں مانگے
اپنے خوابوں کو میں اغوا نہیں ہونے دوں گا

کل کلاں میں ترا عادی بھی تو ہو سکتا ہوں
احتیاطاً تجھے اپنا نہیں ہونے دوں گا

خود ہی ہونا ہے اگر اپنا تماشائی مجھے
پھر حسنؔ ! ایسا تماشا نہیں ہونے دوں گا

○

پہلے نیند کو ساری رات جگاؤں گا
پھر میں تجھ کو خواب سے باہر لاؤں گا

یہ جو مجھ میں خواہشیں دوڑتی پھرتی ہیں
وعدوں کی زنجیر اِنہیں پہناؤں گا

عشق سکھا دے گا کچھ ایسا ہنر مجھے
پانیوں پر تیری تصویر بناؤں گا

ابھی تو میں مصروف ہُوں زخم شماری میں
فرصت ملی تو اپنے غم گِنواؤں گا

ہجر کا ریشم بہت زیادہ اُلجھا ہے
سوچتا ہوں کیسے اس کو سُلجھاؤں گا؟

جاگتی آنکھوں ملنا تو ناممکن ہے
نیند میں چلتے چلتے تجھ تک آؤں گا

یہ جو سفر جاگا ہے حسنؔ اب تلووں میں
کون سی لوری دے کر اسے سلاؤں گا؟

○

ہنر آتے ہیں سب مجھ کو، سو میں دل کو منا لوں گا
مگر پہلے تو اِس ضدی کو سینے سے نکالوں گا

مرے خوابوں میں گر اُس نے ذرا سی بھی خیانت کی
تو میں بھی انتقاماً اُس کی کچھ نیندیں چُرا لوں گا

کرائے پر کسی صورت نہیں دوں گا سرائے جاں
میں دروازے پہ تیرے نام کی تختی لگا لوں گا

مرے کردار کا دورانیہ کم ہو گیا، لیکن
میں تیرے ہجر کو اس کھیل کا حصہ بنا لوں گا

محبت کی بحالی کے لیے نکلے گی جب ریلی
تو میں اس کی حمایت میں خدا کو بھی بلا لوں گا

مجھے معلوم ہے تاریکیاں حد سے زیادہ ہیں
مگر اتنا یقیں ہے ، ایک شمع تو جلا لوں گا

مِرے پیروں تلے سے تم زمیں کو کھینچ کر دیکھو
میں اک پل میں تمہارا آسماں سر پر اٹھا لوں گا

حسنؔ ، اپنوں کی آنکھوں میں اگر بیگانگی دیکھی
تو میں اگلے ہی لمحے خود کو منظر سے ہٹا لوں گا

○

کچھ مٹی میں اُترِیں ، کچھ اُس پار گئیں
اور باقی سب ، عشق کا بوجھ اُتار گئیں

شہرِ وفا میں سکّے بدل گئے جب سے
خوابوں کی اشرفیاں بھی بیکار گئیں

پیار کی بازی کھیلنے نکلی تھیں آنکھیں
اور پہلے ہی داؤ میں مجھ کو ہار گئیں

کب راضی تھیں دل کا کمرہ چھوڑنے پر
سو سو ترلے کیے ، تو آخرِ کار گئیں

اب تو نمائش گاہ میں میلے لگتے ہیں
کھڑکیاں بند ہوئیں ، اور پردہ دار گئیں

مُلکِ سخن کے اصلی شہزادے تھے ہم
حسنؔ ، ہمیں نقلی شہزادیاں مار گئیں

○

اپنے ہمزاد سے اب بات نہیں کرتا مَیں
وہ کہے بھی ، تو ملاقات نہیں کرتا مَیں

چاہتا مَیں بھی ہُوں تجدیدِ تعلّق ، لیکن
اس تعلّق کی شروعات نہیں کرتا مَیں

زندگی، تُو مِرا ہر راز اُگل دیتی ہے
جا، کوئی بات ترے ساتھ نہیں کرتا مَیں

کچھ گدایانِ محبت کو یہی شکوہ ہے
دولتِ عشق کی خیرات نہیں کرتا مَیں

دل کی کاریز میں بہہ جاتا ہے دکھ کا پانی
اب کبھی آنکھ سے برسات نہیں کرتا مَیں

جانتا ہوں ترے ہر سچ کی حقیقت ، لیکن
دیکھ لے تجھ سے سوالات نہیں کرتا مَیں!

غم کے دینار حسن کیوں کروں سب میں تقسیم ؟
ایسے کاموں میں مساوات نہیں کرتا ہوں مَیں

O

سوال ایک ہی ہوتا ہے اُس کی آنکھوں میں
یہ عکس دوسرا کس کا ہے تیری آنکھوں میں ؟

اُسے میں کیسے بتاؤں کہ چار دن پہلے
اُتر گیا تھا میں اک جھیل جیسی آنکھوں میں

اسی لیے تو بدن بھیگا بھیگا رہتا ہے
کہ آج کل مرا مسکن ہے گیلی آنکھوں میں

وہ جانتی ہے کہ دل میں کدھر سے جاتے ہیں
جبھی تو اُتری ہے پہلے وہ میری آنکھوں میں

کچھ اتنی برف گِری کوہِ نامرادی پر
کہ عمر بھر رہی دُکھ کی نمی سی آنکھوں میں

مجھے خبر ہے کہ ان میں وفا نہیں، لیکن
بلا کی کھینچ تو ہوتی ہے نیلی آنکھوں میں

کشش!

مِلا کے ہاتھ وہ رخصت ہوئی، یہ کہتے ہوئے
حسنؔ، عجب سی ہے مستی تمہاری آنکھوں میں

○

(شہر آشوب)

کتنی ہم لکھ پائے، کتنی بھول گئے
لاشیں گنتے گنتے، گنتی بھول گئے

یاد نہیں کب خوابوں کی تدفین ہوئی
دن اور چہلم کیا، ہم برسی بھول گئے

شہرِ وفا میں پیار کا ایسا کال پڑا
اہلِ محبت رسمِ وفا ہی بھول گئے

مائی کلاچی[1] خبر تو لے اُن بیٹوں کی
مستی میں جو تیری ہستی بھول گئے

1۔ کراچی کا پرانا نام

جہاں پہ شام انگڑائی لے کر جاگتی تھی
ہم وہ گلیاں ، اور وہ بستی بھول گئے

حسنؔ ، یہاں اک شہرِ نگاراں ہوتا تھا
کس نے اُس کی مانگ اُجاڑی ، بھول گئے

○

بہت آزار دیتا ہے ، بڑی تکرار کرتا ہے
عجب منکر ہے ، ہر موجود سے انکار کرتا ہے

محبت میں ہے اُس کا رکھ رکھاؤ گوفے والوں سا
بُلا لیتا ہے گھر میں ، اور چھپ کر وار کرتا ہے

کہا بھی تھا یہاں پر ڈوب جانے کا ہے اندیشہ
مگر ضدی یہیں سے آ کے دریا پار کرتا ہے

وہ کوزہ گر ہمیشہ میرے دل کو چاک پر رکھ کر
کبھی تعمیر کرتا ہے ، کبھی مسمار کرتا ہے

عجب اک چپ سی لگ جاتی ہے اُس کو میرے پاس آ کر
مگر جب خواب میں آتا ہے، تب اظہار کرتا ہے

حسنؔ، وہ سوچتا ہے جب بھی شہرِ جاں سے جانے کا
تو ذہنی طور پر پہلے مجھے تیار کرتا ہے

○

حسن ، میں اُس کا قصیدہ کبھی لکھوں گا نہیں
انا پرست ہُوں ، ایسا کبھی کروں گا نہیں

میں اُس کی یاد میں اک رات رو تو سکتا ہوں
مگر میں اُس کی جدائی میں جان دُوں گا نہیں

میں شہرِ عشق میں ادنیٰ سا اک ملازم ہوں
سو ، شاہِ عشق کی بابت بُرا سنوں گا نہیں

اگر وہ شمع کی صورت مجھے جلائے گی
تو دیکھ لینا ، کہ تنہا تو میں جلوں گا نہیں

میں اُس کی راہ میں پلکیں بچھا تو سکتا ہُوں
پر اُس کے ہجر میں آنکھوں کو نم کروں گا نہیں

حسنؔ ، وہ ضد میں اگر عہد توڑ سکتی ہے !
تو میں بھی اُس کے نہ ہونے سے جل مروں گا نہیں

O

نیندوں کے تصور سے بھی ڈر جائیں گے ہم لوگ
بکھریں گے یہی خواب، تو مر جائیں گے ہم لوگ

خوابیدہ کواڑوں سے نہ جھانکے گی کوئی آنکھ
ٹوٹے ہوئے قدموں سے جو گھر جائیں گے ہم لوگ

ہاں رات کی چتون سے "سحر" پھوٹے گی، لیکن
"گلرنگ" سویروں میں بکھر جائیں گے ہم لوگ

چہروں پہ جمی دھول کھرچ ڈالیں ، وگرنہ
خود اپنی ہی صورت سے مکر جائیں گے ہم لوگ

O

(امن کے نام)

خوف کی دیوار میں اک دَر بنا سکتے ہیں ہم
دل میں خواہش ہو، تو یہ منظر بنا سکتے ہیں ہم

اک ذرا سے حوصلے، اور ظرف کی تو بات ہے
تم وہاں مسجد، یہاں مندر بنا سکتے ہیں ہم

جس ورق پر گرگسوں کا خوف ہے چپکا ہُوا
اُس ورق پر تتلیوں کے پَر بنا سکتے ہیں ہم

آرزو کی چار دیواری پہ چھت خوابوں کی ہو
قریۂ جاں میں اک ایسا گھر بنا سکتے ہیں ہم

رنگ اور خوشبو کو لا کر چاہتوں کے چاک پر
گنگناتا اک حسیں پیکر بنا سکتے ہیں ہم

خوف کی تاریک گلیاں پار کرنے کے لیے
جگنوؤں کی روشنی رہبر بنا سکتے ہیں ہم

دہشتوں کے سنگریزے خاکِ جاں میں گوندھ کر
امن کے لاکھوں مہ و اختر بنا سکتے ہیں ہم

جو ہَوا شعلوں کو لے اُڑتی ہے، اس کو بھی حسنؔ
رنگ و بوئے گل کا نامہ بَر بنا سکتے ہیں ہم

(ترمیم و اضافے کے ساتھ)

○

خواب آنکھوں سے گرانا پڑ گیا
جب مکاں کو گھر بنانا پڑ گیا

ایک ناموجود اُترا مجھ میں یوں
خود کو منظر سے ہٹانا پڑ گیا

پانیوں نے بھی صدائیں دیں، مگر
پیاس پر پہرہ بٹھانا پڑ گیا

وہ جو دیوارِ انا مجھ پر گری
اُس کا ملبہ بھی اُٹھانا پڑ گیا

جنگ تو میری تھی اپنے آپ سے
بیچ میں "ظالم زمانہ" پڑ گیا

خواہشوں کی اوٹ میں رکھا تھا جو
وہ دِیا آندھی میں لانا پڑ گیا

اُس نے اب کے چال ہی ایسی چلی
داؤ پر خود کو لگانا پڑ گیا

بے وفائی کس قدر آساں لگی
عشق میں جب سر کھپانا پڑ گیا

اُس گلی میں کچھ تو ایسا تھا حسنؔ
واپس آ کر پھر سے جانا پڑ گیا

○

میں خوشبو کی طرح ہوں، کیسے رکھو گے نہاں مجھ کو
اُڑا لے جائے گی اک دن ہوائے مہرباں مجھ کو

یہ کیسی سرحدِ جاں پر اچانک آ گیا ہوں میں
کہ بانہوں میں لیے جاتا ہے نیلا آسماں مجھ کو

ابھی تک پاؤں اُلجھے ہیں رکابوں میں، خدا جانے
یہ سرپٹ دوڑتا لمحہ گرائے گا کہاں مجھ کو

عجب سی اک صدا رس گھولتی ہے میرے کانوں میں
کہ دعوت دے رہا ہے عالمِ سیارگاں مجھ کو

کوئی ضدی کرایہ دار آئے ، اور ٹک جائے
کہ اب خالی ہی کرنا ہے یہ آسیبی مکاں مجھ کو

نہ جانے کب بتائیں گے حسن یہ سامعین آ کر
کہاں پر ختم کرنی ہے اب اپنی داستاں مجھ کو

○

دل خزانے میں اب ڈوبتی زندگی کے سوا کچھ نہیں
عمر بھر دکھ پہ تقسیم ہوتے رہے ، اور بچا کچھ نہیں

اپنی آئندہ نسلوں کو دُکھ کے سوا اور کیا بانٹتے ؟
جن کو ورثے میں محرومیوں کے علاوہ مِلا کچھ نہیں

خواہشوں کے مسلسل تعاقب میں شل ہوگئی آنکھ بھی
اپنی دہلیز تک آتے آتے نظر میں رہا کچھ نہیں

مدتوں زلزلے ذات کے بند کمروں میں اٹھتے رہے
لیکن اپنی اَنا کے سوا اس مکاں میں گِرا کچھ نہیں

ایسی بے مہر شب تھی کہ اُس شہر سے جب میں رخصت ہُوا
کوئی ملنے نہ آیا، کسی آنکھ نے بھی کہا کچھ نہیں!

دستکوں کی تمنا میں کب تک یونہی جاگنا ہے حسنؔ!
نیند کی گود میں سو رہو، رتجگوں میں دھرا کچھ نہیں

○

شہرِ نامہرباں سے نکلوں گا
یوں میں تیری اماں سے نکلوں گا

لینے آئے گا خود مکاں مجھ کو
جب بھی میں لامکاں سے نکلوں گا

ساتھ ہوگا ہجومِ دل زدگاں
جس گھڑی خاکداں سے نکلوں گا

فتح کرلوں گا جب میں عشق آباد
تب میں تنہا وہاں سے نکلوں گا

پہلے تیرا ہدف بنوں گا میں
پھر میں تیری کماں سے نکلوں گا

مِل نہ پائے گا پھر سِرا تجھ کو
یوں تری داستاں سے نکلوں گا

جنتری دیکھ کر بتاؤ، کہ میں
کب حصارِ زیاں سے نکلوں گا

مار دے گا مِرا یقین مجھے
جب میں تیرے گماں سے نکلوں گا

اسمِ اعظم کا وِرد کرتے ہوئے
میں حسنؔ شہرِ جاں سے نکلوں گا

○

اے کوزہ گر، نہ چاکِ طلب سے مجھے اُتار
میں شکلِ خام ہُوں، نہ ابھی آگ سے گزار

دینارِ عشق دے کے ملے گی متاعِ جاں
چاہت کے لین دین میں چلتا نہیں اُدھار

فطرت ہے تاجرانہ، نہ فکرِ زیاں مجھے
بس ایک دُھن کہ جاری رہے دل کا کاروبار

یاد آئی تیری تین سو پینسٹھ دنوں کے بعد
خواہش تھی تیرا وِرد کروں دن میں پانچ بار

اب دیکھ لینا اِس میں بھی تم ہار جاؤ گی!
کرنے لگا ہوں تشنہ تمناؤں کا شمار

دشتِ طلب میں دوڑنے والوں کو کیا خبر
اب کس کے ہاتھ ناقہء خواہش کی ہے مہار

دیوار کے اُدھر میری آنکھیں اِدھر ہے نیند
اک خواب ہے حسن، جو بھٹکتا ہے آر پار

تمہیں کیا ہُوا، کہ نہ فون، میل، نہ ایس ایم ایس
تمہیں میرا کتنا خیال تھا! تمہیں کیا ہُوا؟

وہ جو دھڑکنیں ہوئیں کالعدم، وہ حسن کی تھیں
سو، تمہارا دل تو بحال تھا، تمہیں کیا ہُوا؟

○

مجھے رفتگان کا ملال تھا، تمہیں کیا ہُوا؟
میں تو کب سے رُو بہ زوال تھا، تمہیں کیا ہُوا؟

مری نیند ٹوٹی، تو خواب بھی کہیں کھو گئے
میں تو رتجگوں سے نڈھال تھا، تمہیں کیا ہُوا؟

میں اسیرِ دل تھا، سو رو پڑا تمہیں دیکھ کر
تمہیں ضبطِ غم پہ کمال تھا، تمہیں کیا ہُوا؟

یہی طے ہوا تھا کہ اب ملیں گے اگست میں
یہ تمہی کو شوقِ وصال تھا، تمہیں کیا ہُوا؟

تمہیں کیا ہُوا ، کہ نہ فون ، میل ، نہ ایس ایم ایس
تمہیں میرا کتنا خیال تھا ! تمہیں کیا ہُوا؟

وہ جو دھڑکنیں ہوئیں کالعدم ، وہ حسن کی تھیں
سو ، تمہارا دل تو بحال تھا ، تمہیں کیا ہُوا؟

○

جو میرے دل میں تھا ایک خدشہ، وہی ہُوا نا!
کہ میں نہیں ہو سکوں گا تیرا، وہی ہُوا نا!

تمہیں بتایا بھی تھا کہ گروی ہیں میری سانسیں
مجھے نہ راس آئے گی یہ دنیا ، وہی ہُوا نا!

کہا تھا تم سے ، نہ اپنے پلّو سے خواب باندھو
یہ اک نہ اک دن کریں گے رُسوا ، وہی ہُوا نا!

مجھے خبر تھی ، تُنک ہوا میں اُڑا کے مجھ کو
وہ رخ بدل دے گی آندھیوں کا ، وہی ہُوا نا!

میں جانتا تھا ، تُو درجہ اوّل کی ہٹ دھرم ہے
سو، تجھ کو ٹکرے گا کوئی تجھ سا، وہی ہُوا نا!

عیاں تھی تجھ پر بھی یہ حقیقت کہ آخر اک دن
میں آئنے سے اُلجھ پڑوں گا ، وہی ہُوا نا!

حسن رضاؔ ، آج پھر اکیلا میں ہو گیا ہوں
جو ابتدا سے لگا تھا دھڑکا ، وہی ہُوا نا!

میں جانتا تھا، تُو درجہ اوّل کی ہٹ دھرم ہے
سو، تجھ کو ٹکرے گا کوئی تجھ سا، وہی ہُوا نا!

عیاں تھی تجھ پر بھی یہ حقیقت کہ آخر اک دن
میں آئنے سے اُلجھ پڑوں گا، وہی ہُوا نا!

حسنؔ رضا، آج پھر اکیلا میں ہو گیا ہوں
جو ابتدا سے لگا تھا دھڑکا، وہی ہُوا نا!

○

نشاں وصال کے سارے مٹا دِیئے گئے تھے
بس ایک دو ہی دیے تھے، سو وہ بُجھے پڑے تھے

اسی لیے ہمیں دکھ تھا چراغ بُجھنے کا
کہ اِس چراغ کی لَو نے ہمارے دکھ سہے تھے

پلٹ کے آئے نہ پھر خواب میری آنکھوں میں
مجھے تو شک ہے، وہ کل رات تم سے جا مِلے تھے

یہ اور بات کہ تھا حافظہ ترا کمزور
وگرنہ چاہنے والے ترے گِنے چُنے تھے

اگر میں تیرے کسی خواب کی نہ تھا تعبیر
تو کیا سمجھ کے تم اُس شب مرے گلے لگے تھے؟

کسی مہینے بھی دیکھا نہ میں نے کیلنڈر
کہ شہر میں ترے آنے کے دن گِنے ہوئے تھے

میں رتجگوں کو حسنؔ کس طرح بُرا کہتا
یہ مجھ سے عمر میں چھوٹے، پر اِن کے دکھ بڑے تھے

○

بٹھادیے گئے پہرے جنازہ گاہوں پر
سو، ہم نے دفن کیے خواب شاہراہوں پر

اب اور کیا ہو پذیرائی خاک زادوں کی
کہ داد ملنے لگی ہے انہیں کراہوں پر

بس اب تو چند دلاسے ہیں ان کے کاسے میں
عجیب وقت پڑا میرے کج کلاہوں پر

یہ پانچ وقتی منافق ہیں با رسوخ اتنے
کہ مِل رہی ہیں انہیں خلعتیں گناہوں پر

ہم ایسے عشق بدوش اب ملیں گے دو ہی جگہ
درِ وصال پہ ، یا دکھ کی خانقاہوں پر

حسن یہ تاش کے پتوں کا کھیل ہے، لیکن
غلام ہو گئے حاوی تمام شاہوں پر

○

یہ خواب زاد ، جو پہلو میں آئے بیٹھے ہیں
میں بولتا ہوں، تو یہ مجھ کو ٹوک دیتے ہیں

سلوک ان کا ہے یوسف کے بھائیوں جیسا
یہ مجھ سے میری بقا کا جواز مانگتے ہیں

میں کیسے خواہشیں رکھوں تمہارے تکیے تلے؟
یہاں تو چاروں طرف آئنوں کے پہرے ہیں

مِلا ہُوں آج میں بارہ برس کے بعد اُسے
خوشی ہوئی کہ وہی رنگ ڈھنگ اُس کے ہیں

نصابِ دل میں ہے شامل بس اک کتابِ وفا
اور اُس میں سب سے زیادہ مرے حوالے ہیں

حسنؔ ، میں کیسے کسی خواب کو کروں مہماں!
کہ رتجگے میری آنکھیں ادھیڑ دیتے ہیں

O

کل تری نیند کے آنگن سے مَیں ہو آیا ہوں
میرا اک خواب وہاں تھا، وہ اُٹھا لایا ہوں

آئنہ دیکھا ، تو اُس میں تھا سراپا تیرا
پہلی بار اپنی محبت پہ مَیں اترایا ہوں

دو برس تک تجھے دیکھا ہے کئی زاویوں سے
تب کہیں جا کے ترا عکس بنا پایا ہوں

تُو مرے ضبطِ محبت کی کبھی داد تو دے
میں تری یاد میں رویا ہوں ، نہ پچھتایا ہوں

دکھ کے موسم اثر انداز نہ ہو پائے کبھی
سچ تو یہ ہے کہ ترے ہجر میں گُملایا ہوں

تُو نے اک بار بھی پوچھا نہ حسنؔ سے آ کر
اس کا مطلب ہے کہ مَیں نام کا ہمسایہ ہوں

O

انگلیوں پر نہ گن سکے صاحب
اس قدر تھے معاشقے صاحب

اُن کے دکھ بھی ہمارے جیسے تھے
وہ جو ہم پر فدا ہوئے صاحب

آخرِ کار خواب زادوں کو
مار دیتے ہیں رتجگے صاحب

عشق سمجھے تھے بائیں ہاتھ کا کھیل
سارے کس بل نکل گئے صاحب

میرؔ و غالبؔ کا پوچھتے کیا ہو؟
خیر سے وہ بھی کم نہ تھے صاحب

حیرتِ حُسن سے بھی بعض اوقات
ٹوٹ جاتے ہیں آئنے صاحب

بہہ گئے ہجر کے سونامی میں
سارے سپنے وصال کے صاحب

پانچویں سمت جانے والوں سے
کون رکھتا ہے رابطے صاحب

جل بھی جائیں ہتھیلیاں چاہے
بُجھنے دوں گا نہ میں دیئے صاحب

جانے وہ ، یا حسن رضاؔ جانے
عشق میں کیسے دکھ سہے صاحب

○

عشق آباد میں سارے قرینے ہجر کے ہیں
نغمۂ غم ہے اور سازینے ہجر کے ہیں

ایک دسمبر ہی پہ نہیں ہیں دکھ موقوف
میرے لیے تو بارہ مہینے ہجر کے ہیں

شوقِ وصال کو کس کھاتے میں درج کروں؟
کارِ زیاں میں سب تخمینے ہجر کے ہیں

ایک تو چہرے گردِ فراق سے اَٹے ہوئے
اور بالائے ستم ، آئینے ہجر کے ہیں

تختۂ دار ہو ، یا پھر یار کا حُجرہ ہو
اُن سے اُترنے والے زینے ہجر کے ہیں

خواہش جو انگشتری ڈھونڈ کے لائی ہے
اُس میں بجائے وصل، نگینے ہجر کے ہیں

حسن رضاؔ ، ممکن ہی نہیں ہم پار لگیں
دکھ دریا ہے اور سفینے ہجر کے ہیں
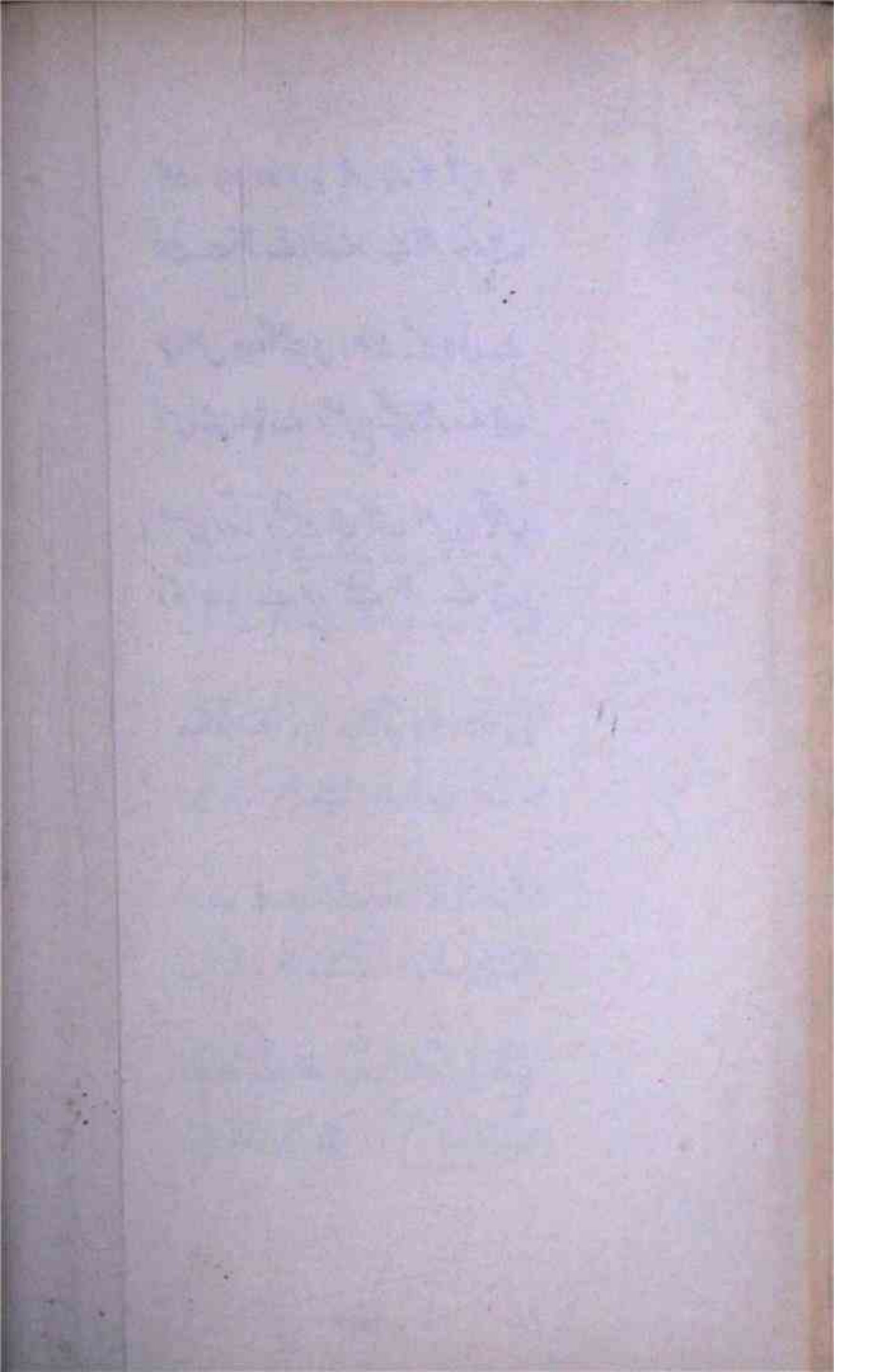
نظمیں
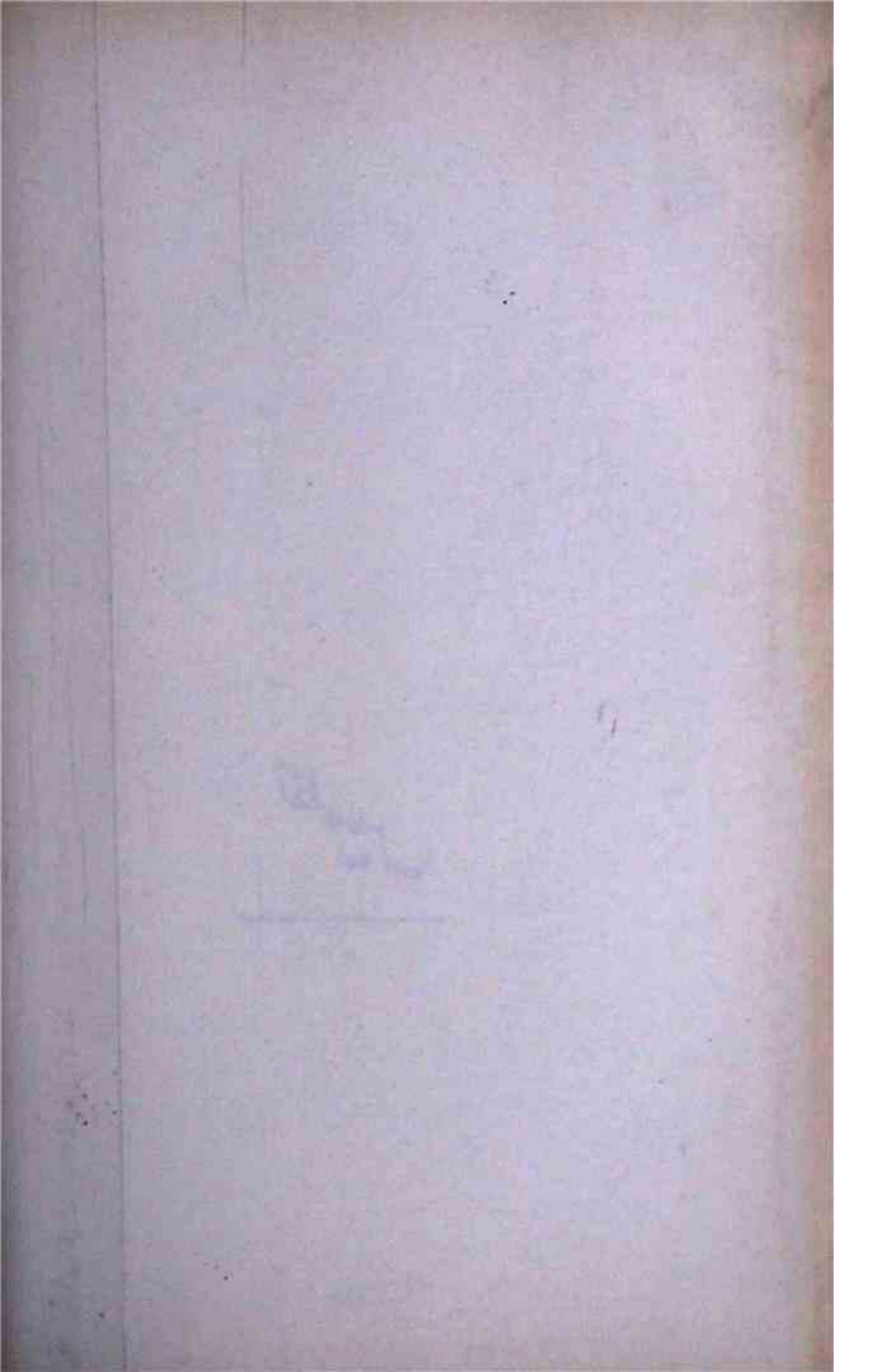
ملکہء ترنم نور جہاں

(28 دسمبر، برسی پر خراجِ عقیدت)

دسمبر بھی ستمگر ہے

کہ اس نامہرباں کے ہاتھ سے

کتنے ہی پیکاں

سینہء عشاق میں اُترے

انہی عشاق میں

اک مہرباں چہرہ بھی تھا

اہلِ وفا جس کو

جہاں کا نُور کہتے تھے

وہ اک کومل، مدھر آواز تھی،

کانوں میں جو رس گھولتی تھی

اور سینوں میں دبی چنگاریوں میں

لَو جگاتی تھی......

صدا کا پیرہن پہنے ہوئے

جب سُرمئی لہروں پہ وہ

کومل سُروں میں گیت گاتی تھی

تو، یوں لگتا تھا جیسے ہر سماعت میں

اُسی کا سُر مہکتا ہے......

ترنّم کی حسیں ملکہ نے

جانے کن جزیروں میں

خموشی اوڑھ رکھی ہے!؟

کہ اب اُس کا سراپا

چشمِ خواہش میں اُترتا ہی نہیں......لیکن

کہیں اُس کی صدا،

اُس کی مدھر لے
خواب کے آنچل میں لپٹی
خواہشوں کے بام پر
شمعِ محبت کی طرح جلتی ہوئی
اب بھی ہمیں رستہ دکھاتی ہے،
مدھر لوری سناتی ہے......
وہ اب ہم میں نہیں، لیکن
سُروں کی اس حسیں ملکہ کا ہر نغمہ
ہوا کے دوش پر اُڑتا ہوا
تختِ سماعت پر اُترتا ہے......
جہاں کا نُور، اب بھی
زینہ زینہ کاسنی کاسوں میں
اپنی مدھ بھری تانوں کا
رس ٹپکا رہا ہے،
گیت کی خیرات کرتا آ رہا ہے

سانول موڑ مہاراں

(1)

تجھ بن سُونا سُونا کمرہ
سُونی ہیں دیواریں،
سب تصویریں لپٹ کے مجھ سے
پل پل تجھے پکاریں
میں تو یوں بچھڑا ہوں خود سے
جیسے کونج قطاراں
سانول موڑ مہاراں

(2)

اُترا جاتا ہے آنکھوں میں
ہجر کی دھوپ کا نیزہ
یاد کی کھڑکی سے بھجوا دو
بادل کا اک ٹکڑا
آرزوؤں کی چھت پر برسے
وصل کی ٹھنڈی باراں
سانول موڑ مہاراں

کیا کٹے رَین

طرفتہ العین!
نگاہوں کا بھرم
مثلِ آئینہِ تخئیلِ حزیں ٹوٹ گیا

دل کرے بَین!
کہ برسوں کا پرانا سایہ
چھوڑ کر دشتِ تمنا میں ہمیں ڈوب گیا

قُرۃ العین!
کبھی تھا، میرا ارمان بھی تھا
یوں ہُوا مجھ سے جدا، خواب بھی ویران ہوئے

اپنے مابین!

یہی طے تھا کہ ہم آنکھوں میں

نامرادی کا کوئی خواب نہ پلنے دیں گے

رت جگوں کو کبھی نیندوں میں نہ ڈھلنے دیں گے

سارے سُکھ چین!

فقط وعدۂ فردا پہ لٹے

اپنی ہی خواہشِ سُر تال نے بے حال کیا

کیا کٹے رَین!

کہ جب صبح کی امید نہ ہو

آفتاب ابھرے، مگر تیرہ شبی چَھٹ نہ سکے

نور تو پھیلے، مگر درد کا گھرا بادل

راہ سے ہٹ نہ سکے

فاصلہ جسموں کا، روحوں سے مگر گھٹ نہ سکے

یاسرہ کے لیے

اُس کی اُجلی اور سیہ آنکھوں میں
اتنی حیرانی تھی......!!
میں تو اُس کو دیکھ کے
آنکھ جھپکنا بھول گیا تھا

یوں لگتا تھا،
جیسے وہ اپنے سب خواب
گنوا بیٹھی ہے،
اور بھُولے دسرے موسم کے
بہتے پانیوں میں
اب سپنے ڈھونڈ رہی ہے

اُس کی کھنکتی اور بے باک
ہنسی میں جانے
کتنے دکھ اور درد چھپے تھے!!

سگرٹ کا کش لے کر
جب وہ دھواں اُڑاتی
تب مجھ کو لگتا تھا جیسے
دھویں کے ساتھ دھواں بن کر وہ
اپنے آپ کو ڈھونڈ رہی ہے......
لیکن اپنے آپ کو ڈھونڈنے والے
کب واپس آتے ہیں!!؟
اُن کے خواب آنکھوں میں
اور آنکھیں مٹی میں سو جاتی ہیں
دکھ کے ہار پرو جاتی ہیں

لیکن مولا!

ان آنکھوں کو روشن رکھنا

ایسی جلتی بلتی آنکھیں

طاقوں میں رکھی ہوں تو

گھر آنگن روشن رہتے ہیں

تن اُجلے اُجلے ہوتے ہیں

من روشن روشن رہتے ہیں

گیت

(غیرت کے نام پر قتل)

کب تک ہمارے نام پہ تم خوں بہاؤ گے
ہنستے گھروں میں درد کے مقتل سجاؤ گے

کب تک ہمارے نام پہ تم خوں بہاؤ گے

تم نے ہمیں کچل دیا غیرت کے نام پر
ہر خوابِ گُل مَسل دیا، غیرت کے نام پر
جن آئنوں نے عکس ہمارے سجائے تھے
اُن پر بھی خون مَل دیا، غیرت کے نام پر
اب اور کتنے تیر ستم آزماؤ گے

کب تک ہمارے نام پہ تم خوں بہاؤ گے

عورت کو تم نے کانچ کا پیکر بنادیا

جی بھر گیا تو خاک میں اُس کو مِلا دیا

اپنے لیے تو رونقیں ساری سمیٹ لیں

لیکن ہمارے خواب پہ پہرہ بٹھا دیا

کتنے فریب دو گے ،کہاں تک رُلاؤ گے؟

کب تک ہمارے نام پہ تم خوں بہاؤ گے

ہاتھوں سے پھسلتی تاریخ کا ایک ورق

بہت دن ہو گئے
بادِ صبا نے کوئی سندیسہ نہیں بھیجا
نہ کوئی لہر
بہتے پانیوں سے ٹوٹ کر آئی
کہ نخلِ خشک کی مرتی جڑوں تک زندگی لاتی
بہت دن ہو گئے ہیں......

اور اِک ہم ہیں
کہ اپنی چھال کے اندر
اُدھڑتی زندگی کا لمحہ لمحہ، گن رہے ہیں
مَر رہے ہیں۔

بہت دن ہو گئے
بادل نے گرلاتی زمینوں کو
کوئی تحفہ نہیں بھیجا
بہت سی ایڑیاں زخما گئیں
لیکن کوئی چشمہ نہیں جاگا
کوئی سوتا نہیں پھوٹا
بہت دن ہو گئے......

بہت دن ہو گئے
کوفے سے کوئی خط نہیں آیا
نہ کوئی ایلچی
دارالامارہ میں گھرے
مختار ثقفی کی خبر لایا
بہت دن ہو گئے......

بہت دن ہو گئے
افتادگانِ خاک نے

دلقِ اویسؔ و چادرِ زہرہؔ کی بابت
کچھ نہیں پوچھا
نہ بوذرؔ
شہرِ مسکن میں دوبارہ لوٹ کر آئے
نہ کوئی نامہ بر پہنچا
بہت دن ہو گئے ہیں......

اور اتنے دن گزرنے پر بھی
اُس نے جھانک کر نیچے نہیں دیکھا
بہت مصروف ہے، یا، پھر
کسی گوشے میں تنہا بیٹھ کر آنسو بہاتا ہے!
بہت دن ہو گئے......
بہت دن ہو گئے
اُس کی خبر بھی اب نہیں آتی!
سو کچھ دن اور بھی ہو جائیں
تو کیا حرج ہو گا......!!
ہم نہیں ہوں گے

مگر کوئی تو ہم جیسا

کسی آتے زمانے میں

اُسے ہاتھوں پھسلتی، ٹوٹتی تاریخ کا

ایک اک ورق دے کر

رسیدی دستخط لے گا۔

یقیناً کوئی ہم جیسا

(پرانی نظم ترمیم و اضافے کے بعد)

شہزادی انعم حسن

جب سے کھلی ہے شاخِ تمنا پہ اک کلی
خوشبو سے بھر گئے مرے دیوار و در تمام
اُتری ہو جیسے شہرِ دُعا سے کوئی پَری
ہنستی ہے جب، تو جھومنے لگتا ہے گھر تمام

قطعہ

اِسی باعث حسنؔ دل کو خسارہ ہوگیا اِتنا
کہ میں نے عشق میں سرمایہ کاری کچھ زیادہ کی
اُسے معلوم تھا بیمار کی یہ آخری شب ہے
سو، اُس نے بھی مری تیمارداری کچھ زیادہ کی

دو شعر

تیری خوشبو سے بھری ہوتی ہیں جیبیں اُن کی
میں نے جس روز بھی پھولوں کی تلاشی لی ہے

ooo

مان ہی جائیں گے اب رُوٹھے خواب مرے
نیند بھری آنکھوں کا جرگہ بھیجا ہے

گیت

کاسنی خیال تھے
نئے سُر تال تھے
میں نے جو بھی گیت بُنے
گائے ہیں وہ تیرے لئے

کاسنی خیال تھے......

پالکی میں خواب تھے
ہاتھوں میں گلاب تھے
تُو نے جہاں پاؤں دھرے
خوشبو کے میلے لگے

کاسنی خیال تھے......

یاد کی منڈیر تھی
سانولی سویر تھی
تُو جو میرے گلے سے لگی
سرسوں بھی کھلنے لگی

کاسنی خیال تھے......

خواہشوں کے گاؤں میں
بیریوں کی چھاؤں میں
میں جو تجھے یاد نہ کروں
رب کرے سانس نہ لوں

کاسنی خیال تھے......
نئے سُر تال تھے......

نوٹ: تصور خانم کے گائے ہوئے پنجابی گیت "باری تھانی چڑھ میاں نوں واجاں ماریاں" کی کمپوزیشن پر یہ اردو گیت لکھا گیا۔

حسن عباس رضا کی شاعری سے میرا انتخاب

احمد مسعود

آوارگی میں حد سے گزر جانا چاہیے
لیکن کبھی کبھار تو گھر جانا چاہیے
اُس بُت سے عشق کیجئے، لیکن کچھ اس طرح
پوچھے کوئی تو صاف مُکر جانا چاہیے

○

درد کسی کا بھی ہو، رونے ہم لگتے ہیں
ہمیں تو جیسے آنکھ بھگونے کا نشہ ہے

میں اُسے شام کی آغوش میں دے آیا تھا
کیسے وہ رات کی دلدل میں گرا میرے بعد؟

○

محبتیں تو فقط نقدِ جاں ہی مانگتی ہیں
محبتوں میں بھلا کون اُدھار دیتا ہے

○

کہتی ہے کہ دن بھر جہاں مرضی، وہاں جاؤ
واپس مرے پاس آنا مگر شام سے پہلے

○

گھر سے نکلے تو بس اک ماں کی دعا تھی جیب میں
عمر کے میلے میں پہنچے تو وہی گم ہو گئی

○

جس پر چار قدم چل کر شہزادی جائے
ایسے رستے کی توقیر بڑھا دی جائے
گھٹنوں کے بَل چلنے والے بچوں کو بھی
رخشِ صبا رفتار کی باگ تھما دی جائے

وہی لوگ ہیں، وہی نام ہیں، وہی گھر، وہی در و بام ہیں
مگر اب دریچوں کی اوٹ سے ہمیں جھانکتا کوئی اور ہے
اُسے مل کے آئے تو شام کو، مجھے آئنے نے کہا، سنو
وہ جو صبحدم تھا حسن رضاؔ، وہ تمہی ہو، یا کوئی اور ہے؟

○

کیا رکھا ہے وصل کی لمبی راتاں میں عباس رضا
دھرا ہے کیا اب گئے دنوں کی باتاں میں عباس رضا
خوش قسمت وہ لوگ ہیں جن کو تپتی رت راس آتی ہے
تم تو جل کر خاک ہوئے برساتاں میں عباس رضا

○

بدن میں قطرہ قطرہ زہر اُتارا جارہا ہے
کہ ہم کو آج کل قسطوں میں مارا جارہا ہے

○

ہنسی خوشی سے حُسن کا بوجھ اٹھاتے ہیں ہم
اپنی گزر اوقات اسی مزدوری پر ہے

آنکھوں سے خواب، دل سے تمنا تمام شد
تم کیا گئے، کہ شوقِ نظارہ تمام شد
کل تیرے تشنگاں سے یہ کیا معجزہ ہُوا
دریا پہ ہونٹ رکھے، تو دریا تمام شد

○

خوابوں کی تجارت میں ہُوا اتنا خسارہ
کھولی نہیں پھر شہر میں ہم نے بھی دکاں اور

○

یہ تو ہوسکتا ہے ہم بیچ دیں آنکھیں، لیکن
ہم سے خوابوں کی خریداری نہیں ہو سکتی

○

مُلکِ سخن کے اصلی شہزادے تھے ہم
حسنؔ ہمیں نقلی شہزادیاں مار گئیں

○

پاؤں میں پھر سفر اُتر آیا
نو برس بعد جب میں گھر آیا

ہمیں رسوا کیا اس نیند میں چلنے کی عادت نے
وگرنہ جاگتے میں ہم کبھی ایسا نہیں کرتے
حسنؔ، جب لڑکھڑا کر اپنے ہی پاؤں پہ گرنا ہو
تو پھیر ایڑی پہ اتنی دیر تک گھوما نہیں کرتے

○

مفاہمت کی کوئی رہ نکال لیتے ہیں
نہیں قبول، تو سکّہ اچھال لیتے ہیں
کبھی جو سر میرے کاندھے پہ رکھ کے سوتی تھی
اُسی کی شال کو کاندھے پہ ڈال لیتے ہیں

○

رگوں میں برف سی جمنے لگی ہے، روح کی شہزادگی کم ہو رہی ہے
نظر میں جھلملاتے ماہ و انجم بجھ رہے ہیں، روشنی کم ہو رہی ہے
تعلق کی وہ شاخِ سبز، جس پر پھول کھلتے تھے سیہ ہونے کو ہے اب
مروت کی جو تھوڑی سی مہک آتی تھی، اب وہ اور بھی کم ہو رہی ہے
حسنؔ جی چاہتا ہے موت کو بھی تحفۂ جاناں سمجھ کر گھر میں رکھ لوں
کہ اب یہ زندگی بے رس ہوئی جاتی ہے، اس میں دلکشی کم ہو رہی ہے

گھوم کر رہ گیا میں ایڑی پر
جب اچانک وہ بام پر آیا

○

کمال یہ ہے، کہ میں نے بُھلا دیا اُس کو
وگرنہ کام یہ آسان تھوڑی ہوتا ہے
عذاب ہوتا ہے اُن کے لیے، جو سوچتے ہیں
بتانِ سنگ کو سرطان تھوڑی ہوتا ہے

○

دینارِ عشق جس طرح چاہے اُچھال لو
لکھا ملے گا نام ہمارا اِدھر اُدھر
جس روز ہم اِدھر سے اُدھر ہو گئے حسنؔ
ڈھونڈے گی پھر ہمیں یہی دنیا اِدھر اُدھر

○

جسم کی چاندی سفر کرتی سروں تک آ گئی
اب ملن رُت کا کریں کیسے یقیں شہزادیاں
ہم سخن کی سلطنت کے شاہزادے ہیں حسنؔ
شاعری کے روپ میں ہم کو ملیں شہزادیاں

اپنے ہونٹوں سے مرا کاسہء لب بھر دینا
اِس طرح جسم کی خیرات نکل جاتی ہے
اکثر اوقات سما جاتا ہے کوئی مُجھ میں
بعض اوقات مری ذات نکل جاتی ہے

○

سینے کی خانقاہ میں آنے نہیں دیا
ہم نے اُسے چراغ جلانے نہیں دیا
شامِ وداع تھی مگر اُس رنگ باز نے
پاؤں پہ ہونٹ رکھ دیئے، جانے نہیں دیا

○

مل نہیں پایا حسنؔ اُس کا کوئی ثانی ہنوز
آنکھ میں ٹھہرا ہُوا ہے ہجر کا پانی ہنوز
اب بھی ہونٹوں پر نمک اُس سانولے چہرے کا ہے
میرے سارے ذائقوں میں ہے وہ مرجانی ہنوز

آئینے میں ڈھونڈتے ہیں اب تو اپنے خدوخال
ہم کبھی ایسے نہیں تھے، تُو نے جیسا کر دیا
اپنی آنکھیں بھی میں چھوڑ آیا تری دہلیز پر
مجھ کو اس دیدار کی خواہش نے اندھا کر دیا

○

ہم کھنچے آئیں گے مسجدِ عشق میں
جب بھی مینارِ جاں سے اذاں ہوئے گی
چُوم لیتی تھی وہ میرے آنسو حسنؔ
میری ماں جیسی کیا کوئی ماں ہوئے گی

○

شاید اب کے برس میرا دلدار بھیجے کوئی خط مجھے
شاید اس بار خط میں ہو میرے لئے، کوئی اچھی خبر
فون کرنے میں کوئی تکلف اگر ہے تو جانِ حسنؔ
بھیج دو آج کی شام ای میل سے کوئی اچھی خبر

کیسے بتائیں ہجر کی ساعت کتنی بھاری تھی
تین سو پینسٹھ دنوں سے لمبی رات گزاری تھی
سورج کے ڈھلتے ہی اُس نے رکھ دیئے ہونٹ پہ ہونٹ
عشق کے روزہ داروں کی بھی کیا افطاری تھی

○

آنکھوں سے کوئے یار کا منظر نہیں گیا
حالانکہ دس برس سے مَیں اُس گھر نہیں گیا
بچوں کے ساتھ آج اُسے دیکھا، تو دکھ ہُوا
اُن میں سے کوئی ایک بھی ماں پر نہیں گیا

حسن عباس رضا......ایک تاثر

احمد ندیم قاسمی

حسن عباس رضا اس دور کی جدید نسل کا نہایت باشعور اور نہایت ذہین نمائندہ ہے اسے تخلیق کار کے منصب و مقام کا علم ہے چنانچہ وہ ان جملہ فرائض کو تخلیقی سطح پر پورا کرنے کی کامیاب کوشش کرتا ہے جو کسی بھی دور کے فن کار پر اس کی معاشرت اور تہذیب اور تاریخ کی طرف عائد ہوتے ہیں۔ اس میں منفیت کی جو غیر ملکی تحریکیں نوجوانوں کا فیشن بن چکی ہیں، ان سے وہ صاف دامن بچا گیا ہے اور یوں اس کا کلام بے معنویت یا لایعنیت کی زد میں کبھی نہیں آیا۔ وہ اثبات کا شاعر ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے ہمسنوں کی لمبی قطار میں تین چار ساتھیوں کے ہمراہ ایک الگ اونچے مقام پر کھڑا دکھائی دیتا ہے۔

حسن عباس رضا غزل اور نظم دونوں کا شاعر ہے مگر اس کا تخلیقی جوہر بطور خاص غزل میں کھلتا ہے۔ اس نے غزل کی متعدد روایات میں سے ان روایات کو کھلے دل سے اپنایا ہے جو دور حاضر میں بھی بامعنی ہیں۔ ساتھ ہی اس نے اپنے عصر کی صورت حال کو بھی اپنی غزل میں سمیٹا ہے اور اُردو کے ان جدید غزل گو شعراء کی صف میں شمولیت کی طرف بڑھ رہا ہے جن میں فراق، اور فراز، ناصر اور اطہر نفیس، احمد مشتاق اور شکیب شامل ہیں۔ حسن عباس رضا کے ہاں بھی ان سب اعجاز کاروں کی طرح روایت اور جدت کا وہ متوازن امتزاج موجود ہے۔ جس نے چار طرف منفی یلغاروں کے باوجود صنف غزل کو نہ صرف زندہ رکھا ہے بلکہ اس میں موضوعات کی مختلف جہات پیدا کی ہیں۔ حسن عباس رضا ایک ترقی پسند، ارتقا پسند، تعمیر پسند شاعر ہے اس لیے اس کی غزل کے دائرے میں انسانیت متعدد مثبت امکانات سے سج کر جلوہ نما ہوتی ہے۔

حسن عباس رضاؔ کی مطبوعات

شعری مجموعے

۱۔ خواب عذاب ہوئے — مجموعہ کلام (۱۹۸۵_۱۹۹۳ء)

۲۔ نیند مُسافر — مجموعہ کلام (۱۹۹۵ء)

۳۔ تاوان — مجموعہ کلام (۲۰۰۴)

۴۔ دریا تمام شد — مجموعہ کلام (۲۰۱۱)

۵۔ عشق بدوش — مجموعہ کلام (۲۰۱۵)

بطور مرتب

۶۔ پاکستان کے بہترین افسانے

۷۔ ہندوستان کے بہترین افسانے

۸۔ فسادات کے افسانے (۱۹۹۹ء)

۹۔ پاکستان کی بہترین غزلیں

۱۰۔ ہندوستان کی بہترین غزلیں

۱۱۔ محبت کی نظمیں (۲۰۰۴ء)

۱۲۔ پاکستانی اہلِ قلم کی ڈائریکٹری (۱۹۸۰ء)

بطور مدیر

۱۳۔ خیابان (۱۹۷۹_۱۹۹۶ء)

۱۴۔ دوست (بچوں کا رسالہ)

زیر طبع

۱۵۔ گلزار۔ فن اور شخصیت

۱۶۔ حسین بن منصور حلاج

۱۷۔ احمد فراز، شخص و شاعر
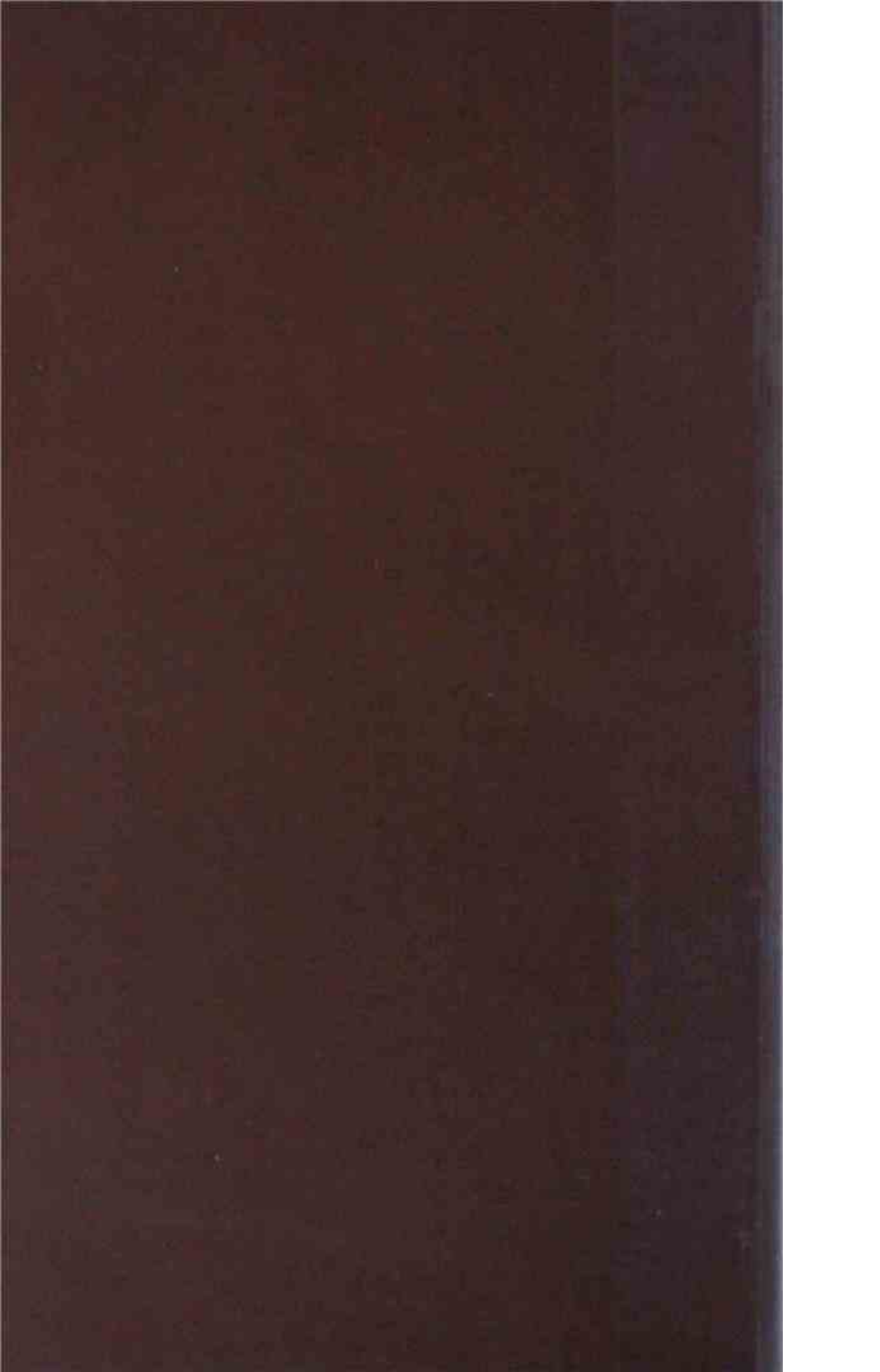
تاریکی، تشدد اور تنگ نظری کی مجموعی فضا میں محبت کی باتیں کرنا بھی احتجاج اور مزاحمت کی ایک شکل ہے۔ ظاہر ہے کہ ہمارا زمانہ اس کے لیے سازگار نہیں، شاید اسی لئے حسن عباس رضا کی غزلوں میں عشقیہ تجربے اور طرزِ احساس کے ساتھ ساتھ مجھے فکر کی ایک نئی اور منفرد جہت سے روشناس ہونے کا موقع بھی ملا اور ان کا کلام پڑھنا مجھے بہر حال بہت اچھا لگا۔

اُن کی غزلوں میں تازگی اور پختہ کاری کی ایک دل چسپ اور رنگا رنگ کیفیت بھی ملتی ہے۔ وہ روایتی اور آزمودہ اسالیب کو بھی ایک نئی سطح پر برتنے کا سلیقہ رکھتے ہیں اور بہ ظاہر پرانی زمینوں میں نئے شعر بڑی مہارت کے ساتھ نکال لیتے ہیں، تقریباً تمام غزلوں میں ان کی انفرادیت کا رنگ بھی روشن ہے۔

حسن عباس رضا کے کچھ شعروں اور زمینوں کی داد تو نہایت روایتی مزاج رکھنے والے اساتذہ بھی دیتے ہیں، امتحان اور آزمائش کے اس دور میں انہوں نے اپنے لیے ایک مشکل راستے کا انتخاب کیا ہے اور یہ راستہ وہ بڑی کامیابی کے ساتھ طے کر رہے ہیں۔

شمیم حنفی

دہلی، بھارت

ISBN: 978-969-496-486-7